قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

قیمت فی پرچہ
۴
چار روپے

ٹیلیفون
87 92 46
خط و کتابت
ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ـــــ ۴۸ روپے
غیر ممالک ـــــ ۱۱۰ روپے

جلد (۴۰) | نومبر ۱۹۸۷ء | نمبر ۱۱

فہرست

۱۔ لمعات ۲
۲۔ قرآنی پاکستان کیسا ہوتا؟ (محترم پرویز صاحب) ۱۱
۳۔ مہلت کا وقفہ۔ (ثریا عندلیب) ۳۸
۴۔ حقائق و عبر ۴۲
۱۔ شریعت بل کا المیہ
۲۔ مودودی صاحب کا اخلاق
۳۔ پاکستان میں علماء کا کردار
۴۔ حرام، حلال، پھر حرام پھر حلال
۵۔ دین کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے؟ ۴۶
(محترم پرویز صاحب)
۶۔ افکارِ پرویز کی صدی ۴۹
(محمد اسلام کراچی)

لمعات

پیامِ اقبالؒ

دیا اقبالؒ نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا

اکثر یہ گلہ سننے میں آیا ہے کہ کلامِ اقبالؒ تو عام ہے لیکن پیامِ اقبالؒ کم [redacted] ہے۔ حتیٰ کہ وہ ادبی محفلیں جن کا وجود اقبالؒ کے نام پر قائم ہے، تنقیدی کارروائی سے زیادہ کچھ نہیں کرتیں۔ بڑے بڑے ادارے یومِ اقبالؒ مناتے ہیں جہاں، بزعمِ خویش، چوٹی کے مقرر یہی کہتے سنائی دیتے ہیں کہ اقبالؒ نے سوئی ہوئی قوم کو جگا دیا۔ اس کی شاعری اسلام کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے، اُس نے اللہ کے دین کو عجیب پیرائے میں پیش کیا ہے، اُس نے وہ پیام دیا جس میں انسانیت کی فلاح اور استحکام کا راز مضمر ہے۔ وہ مشرق ہی کا نہیں تمام نوعِ انسانی کا شاعر تھا۔

آپ نے غور کیا کہ کہیں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ اقبالؒ نے جو فلسفۂ حیات پیش کیا ہے وہ فلسفہ ہے کیا؟ وہ پیام جو اقبالؒ دینا چاہتے تھے ..... کیا ہے؟ اُن کے سینہ میں وہ کون سی تڑپ، وہ کون سی آتشِ سوزاں تھی، وہ کون سا مقصد تھا جس کی خاطر وہ عمر بھر غلطاں و پیچاں رہے، وہ کون سا مقدس جہاد تھا جس کی وجہ سے ؎

خبر اقبالؒ کی لائی ہے گلستاں سے نسیم
نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

اقبالؒ تو ایک انسان تھا، اُس کتابِ عظیم کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوا جو خدا کا کلام اور نبی آخر الزماںؐ کا پیام ہے اور جس کے تسلط اور جبروت کا یہ عالم کہ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

اُس کے [redacted] رہے کہ اس کی تلاوت کو جزوِ ایمان اور ملّت کا اجتماعی فریضہ سمجھا گیا،

اور معانی اس لیے بدل گئے کہ اُس پر عمل ایک ذاتی اور مذہبی معاملہ قرار دیا گیا۔ حسنِ قرأت کے اصُولوں پر عموماً سب متفق ہیں۔ لیکن جہاں اس کے عملی پہلو کا تعلق ہے وہاں یہ کہا گیا کہ جس طرح کسی کا جی چاہے عمل کرے، مقصد تو سب کا خدا کی عبادت ہی ہے۔ اس روشِ زندگی نے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ وہی دیرینہ اسباقِ سامری ایک ایک کر کے سامنے آتے گئے اور اپنے خصوصی سحر کارانہ انداز سے معاشرتی نظام میں پیوست ہوتے چلے گئے۔ اس طرح ہوائے شیطنت کمزور بیڑوں کو ڈبوتی رہی اور "خیر الاُمم" تختۂ غفلت پر سوتی رہی تاآنکہ قلزمِ ابلاس کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سیلاب رموزِ جہانبانی کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ اس کے بعد برسوں، مسلمان تذبذب اور بددلی کے عالم میں مارا مارا پھرتا رہا۔ زمین اپنی وُسعتوں کے باوصف اُس پر اس طرح تنگ ہوگئی کہ ایک لمحہ ستانے کے لیے اُس کو کہیں ٹھکانا نہیں ملتا تھا۔ زمین اُس کو بوجھ سمجھتی۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جو کوئی بھی چاہتا اُنہیں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح ہانک کر اپنے آگے لگا لیتا اور یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ اکثر انہیں غیروں کے باڑوں میں دھکیل دیا گیا اور منہ مانگے دام وصول کیے گئے۔ اس محرومی اور ناکامی کی حالت میں خانماں برباد مسلمان دربدر اور خاک بسر پھرتے رہے۔ ان کی ایسی ہوا اُکھڑی کہ انہیں کوئی منہ بھی نہ لگاتا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کدھر جائیں اور انہیں اِس گردابِ بلا سے کون باہر نکالے۔ اِس طرح ؎

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو — ترس گئے تھے "کسی مردِ راہ داں کیلئے"

ان کے انحطاط کی یہ کیفیت کہ :

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سُورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

مبدائے فیض کی کرم گستری سے انہیں میں سے ایک مردِ راہ داں پیدا ہوا جسے دُنیا نے اقبالؒ کے نام سے یاد کیا۔ اقبالؒ کا مقام کیا بیان کریں۔ وہ شاعر تھا؟ نہیں! شاعری تو اس کے حسین نقاب تھی، جس کے پیچھے ایک دُرِ ناسفتہ پوشیدہ تھا۔ یہ شاعری کیا تھی؟ یہ ایک ایسا ساز تھا جس کے تاروں میں ایک رنگین نغمے کی لے مستور تھی۔ چونکہ کسی جوہر کو پوشیدہ رکھنے سے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے اِس لیے خود اقبالؒ کے دل سے یہ صدا اُبھری ؎

کیوں ساز کے پردے میں مستور ہو لے تیری — تو نغمۂ رنگیں ہے، ہر گوش پہ عریاں ہو
تو جنسِ محبت ہے، قیمت ہے گراں تیری — کم مایہ ہیں سوداگر، اِس دیس میں ارزاں ہو

اقبالؒ نے شاعری اور شاعری میں امتیاز کرتے ہوئے فرمایا:

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے — عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

اس جذبہ کے تحت اقبالؒ نے سب سے پہلے یہی مناسب سمجھا کہ ملّت کو جو مرض گھُن کی طرح کھا رہا ہے اس کی تشخیص کی جائے، پھر اُس کا علاج تجویز کیا جائے۔ یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ اس کے لیے اُنہوں نے جو راستہ اختیار کیا اس کے متعلق وہ استعارۃً فرماتے ہیں۔

شبے پیشِ خدا بگریستم زار — مسلماناں چرا زارند و خوارند

"ایک رات میں نے اللہ کے حضور زار و قطار رو رو کر عرض کیا کہ اے بارِ الٰہا! مسلمانوں کی محرومی کے اسباب کیا ہیں؟"

ندا آمد نمی دانی کہ ایں قوم — دلے دارند و محبوبے نہ دارند

"جواب ملا کہ اس قوم کی محرومی کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ان میں جذبۂ عمل موجود ہے، لیکن مقصودِ عمل اِن کے سامنے نہیں۔"

اس جواب کے بعد اقبالؒ کی دُور بیں نگاہیں فوراً اس نتیجہ پر پہنچ گئیں کہ مسلمانوں کی محرومی کے اسباب کوئی نئے نہیں اور نہ ہی ان کا علاج نیا ہے:

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

یعنی مرض، قرآن سے اغماض اور علاج تمسک بالقرآن۔ وہ کیوں؟ اس لیے کہ ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخہ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ اُو رحمۃ للعالمیںؐ
برخور از قرآں اگر خواہی ثبات — در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

جب انسان اس حقیقت کو اپنے دل کی گہرائیوں سے قبول کر لیتا ہے تو اس چشمۂ فیض رساں سے وہ سوتیں پھوٹتی ہیں جو یقینِ محکم کو سیراب کرتی ہوئی، ہفت اقلیم سے ماوراء، ہفت گردوں پر احاطہ کر لیتی ہیں۔ اس مقام پر علامہ اقبالؒ کہتے ہیں ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا

اقبالؒ جس معاشرہ کی تشکیل چاہتے ہیں، اُس معاشرہ کے مردِ مومن کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

دیگر مقامات پر فرمایا:

تو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا		خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے		یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی		ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی!		نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے!
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

بالفاظِ دیگر ؎

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ		اور انتظارِ مہدی و عیسےٰ بھی چھوڑ دے

وہ اس لیے کہ:

ہوئی جس کی خودی پہلے نمودار		وہی مہدی وہی آخر زمانی

اقبالؒ انسان کی نشوونما کے لیے بڑا وسیع میدان تجویز کرتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے بے کراں ہو جا

پھر اسے موج سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج		اُبھر کر جس طرف چاہے نکل جا

اس کے تسلسل میں فرمایا:

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے		راہ تُو، رہرو بھی تُو، رہبر بھی تُو، منزل بھی تُو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا		ناخدا تو، بحر تُو، کشتی بھی تُو، ساحل بھی تُو

پھر فرمایا:

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے		خودی میں ڈوب کر ضربِ کلیم پیدا کر

اس لیے کہ زندگی ایسی شے نہیں جس کا حلقہ محدود کیا جائے ؎

تو اُسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
پُختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

اقبالؒ خودی کو انسانی ذات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اگر انسانی ذات (خودی) کی نشو و نُما ہو جائے تو وہ خارجی تغیّرات سے غیر متأثر رہتی ہے۔ فرمایا:

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہُر کر نہ سکے
ہو اگر خودگر و خودنگر و خودگیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

انسان کی نشو و نما کا راز یہ بتایا کہ

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِ زندگانی ہے

اور ـــ

خودی کا سرِ نہاں لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللہ!

یعنی ؎

خودی را از وجودِ حق وجودے
خودی را از نمودِ حق نمودے

علامہؒ محض یقین کو ہی کافی نہیں سمجھتے بلکہ وہ یقین کے ساتھ عملِ پیہم کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ فرمایا:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اس کا مطلب یہ ہُوا کہ کوئی قانون، کوئی ضابطہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، وہ اُس وقت تک نتائج برآمد نہیں کر سکتا جب تک اُس کو عملی طور پر نافذ نہ کیا جائے یا اُس پر عمل نہ کیا جائے۔ مثلاً یہ ہمارا یقین ہے کہ چینی میٹھی ہے۔ لیکن جب تک آپ اُسے استعمال میں نہیں لائیں گے وہ مٹھاس مہیّا نہیں کرے گی۔ اسی طرح خُدا کے قانون پر اور اُس کی افادیت پر ایمان اور یقین اس وقت تک کارگر ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اُسے عملی جامہ نہ پہنایا جائے۔ اس لیے اقبالؒ محض یقین پر ہی اکتفا کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ عمل کو بڑی اہمیّت دیتے ہیں۔ یعنی عمل ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے ہم مطلوبہ نتائج سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی!
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یعنی انسان کی کوئی فطرت نہیں، اُس کی کوئی لکھی ہوئی تقدیر نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ؎

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات — مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

جو مسلمان اپنی محرومی و محکومی کو محض تقدیر کا اثر سمجھ کر عضوِ معطّل کی طرح بیٹھ رہتے ہیں اُن کے بارے میں کہا ہے

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

ایسے لوگوں کو وہ جھنجوڑ کر کہتے ہیں ؎

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے — خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں — تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

انسان کا معاملہ دیگر اشیائے کائنات سے بالکل مختلف ہے۔ یہ سب مقدّر ہیں۔ وہ اسی پیمانے اور اندازے کے مطابق گردش کرنے پر مجبور ہیں جو ان کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے۔ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار و ارادہ عطا کیا ہے۔ اُس کے صبح و شام میں ہرگز تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔ ؎

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اور قرآنِ حکیم کی زبان میں — اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (۱۳/۱۱)
"خدا کا قانون یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ کرے اُس کی خارجی دنیا میں تبدیلی نہیں آسکتی۔"

فکرِ اقبالؒ کی رُو سے انسانی ذات کی نشوونما کا راز اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں مضمر ہے۔ ان کے نزدیک یہ ... غلط ہے کہ کوئی شخص تنہا رہ کر اپنی ذات کی نشوونما کر سکتا ہے۔ وہ معاشرے سے باہر فرد کی ذات کو تسلیم ہی نہیں کرتے، وہ اس کو ایک حسین مثال سے واضح کرتے ہیں کہ ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اور ؎

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال فصلِ خزاں اُس کے واسطے — کچھ واسطہ نہیں ہے اُسے برگ و بار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تُو — واقف نہیں ہے قاعدۂ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

اقبالؒ انسانیت کو ایک "اکائی" کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ تقسیم انسانیت کے قائل نہیں۔ انہوں نے بتایا کہ قرآن کی رُو سے، تمام انسانوں کی تخلیق نفسِ واحدہ سے ہوئی۔ حصولِ مقصد کے ذرائع مختلف ہو سکتے ہیں لیکن منتہائے مقصود دو نہیں ہو سکتے۔ انسان محض انسان ہونے کی وجہ سے قابلِ تکریم ہے۔ علاقائی اور قبائلی بنیادوں پر مصنوعی تقسیم انسانیت انسانی تکریم میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔ وہ اس مصنوعی تقسیم کے خلاف بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ انسانیت کے انحطاط اور گراوٹ کو تقسیم انسانیت کا نتیجہ اور ہوسِ اقتدار کا صلہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس مصنوعی حد بندی کے توڑنے کی اس طرح تلقین کرتے ہیں ؎

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا

پھر کہا ؎

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

اس کے بعد خاص طور پر وحدتِ ملتِ اسلامیہ کے بارے میں کہا ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہے سب کا نبی، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

اقبالؒ حصولِ مقصد کے لیے دین میں اجتہاد کی ضرورت پر بڑا زور دیتے ہیں۔ وہ دینِ اسلام کو (PERMANENCE AND CHANGE) تغیر و ثبات کا حسین امتزاج کہتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو دریا کی مثال سے واضح کرتے ہیں۔ یعنی دریا، دو کیفیتوں کا نام ہے۔ ایک (BED) طاس اور دوسرا پانی۔ جہاں تک طاس کا تعلق ہے، اس کو ثبات ہے۔ لیکن جہاں تک پانی کا معاملہ ہے، اُس میں تغیر ہے۔ یہ دونوں کیفیتیں قائم رہیں تو دریا کو دریا کہا جا سکتا ہے۔ اور اگر صرف پانی ہے تو اس کے کئی نام ہو سکتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پانی کو رواں دواں رہنا چاہیئے۔ اگر پانی کے آگے بند ڈال دیا جائے تو وہ جوہڑ بن جائے گا۔ لیکن جب یہی پانی اپنے مقررہ ساحلوں سے باہر نکل آئے تو آس پاس کی بستیوں کو بہا کر لے جاتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ دین کا ہے۔ قرآنی اصولوں کو ثبات ہے۔ وہ تبدیل نہیں ہو سکتے۔

لیکن جہاں تک جزئیات (BYE LAWS) کا تعلق ہے، وہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ملّت کے باہمی مشورہ سے بدلتے رہیں گے بشرطیکہ اصل اصول، یعنی قرآن سے متصادم نہ ہوں۔

یہاں تک تو فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں توحید، ایمان، مومن، خودی، عمل، اجتماعی زندگی، وحدتِ انسانی، اتحاد اور اجتہاد پر بحث کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ فکرِ اقبالؒ کا ایک ایسا پہلو بھی ہے جو ان سب پر محیط ہے اور وہ ہے قانونِ الٰہی کا نفاذ و قیام — اُس قانون کا نفاذ جو قرآنِ حکیم کی دفتین میں اپنی آخری اور مکمل شکل میں محفوظ ہے۔ اس قانون کا نفاذ، جو افرادِ انسانیہ کی پرورش کا ذمہ دار ہے۔ جس میں کوئی شخص اپنی محنت کے ماحصل سے محروم نہیں رہتا اور جس میں کوئی شخص اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریاتِ زندگی کے معاملہ میں کسی دوسرے شخص کا محتاج نہیں ہوتا۔

اس نظام کے قیام کی راہ میں جو چیز سب سے زیادہ سدِّ راہ ہے، اقبالؒ کے نزدیک وہ سرمایہ داری ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر، اقبالؒ نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اپنی مشہور نظم "خضرِ راہ" میں خضرؑ سے سوال کرتے ہیں کہ: ؎

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور خضرؑ کی زبانی اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے — خضرؑ کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ جُو — شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار — انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

"بالِ جبریل" میں فرشتوں کا گیت، اسی روحِ انقلاب کا طنزیہ نشتر ہے۔ وہ خدائے کائنات کو مخاطب کر کے شکوہ سنج ہیں کہ ؎

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیر و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی!

یہی وہ احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ ؎

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

یہ سب کچھ کہہ کر، اقبالؒ ایسے مثالی معاشرہ کا قیام چاہتے ہیں جس کی کیفیت یہ ہو ؎

نے ببازاراں ز بے کاراں خروش
نے صدا ہائے گدایاں در دِ گوش
کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولیٰ حاکم و محکوم نیست

اور اس کا ماحصل ہے ؎

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبین ایں است و بس

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اقبالؒ کی فکر اور پیام کا نقطۂ ماسکہ، قانونِ الٰہی کا نفاذ ہے۔ وہ قانون جو قرآنِ حکیم کی دفتین میں اپنی آخری اور مکمل شکل میں محفوظ ہے۔ اس قانون کا نفاذ جو افرادِ انسانیہ کی پرورش اور نشو و نما کا ضامن ہے! اقبالؒ اس قانون کے نفاذ کے لیے خطۂ ارض کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے مسلمانانِ ہند کے سامنے پاکستان کا منصوبہ پیش کیا اور پھر مسلمانانِ ہند، اس منصوبہ پر عمل کر کے پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ؎

دیا اقبالؒ نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا
وہ اِک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

مسلمانانِ ہند اقبالؒ کے "سوز" کو سمجھ گئے اور مقصود حاصل کر لیا۔ دیکھتے ہیں مسلمانانِ پاکستان اقبالؒ کے پیغام کی طرف کب دھیان دیتے ہیں اور پاکستان کے اندر وہ قانون اور نظام نافذ کرتے ہیں جس کے لیے یہ خطۂ ارض حاصل کیا گیا تھا۔

آخر میں ہم پیامِ اقبالؒ کے سلسلہ میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس مختصر وقت میں اس بحرِ ذخّار کا بہ تمام و کمال بیان ناممکن ہے لیکن اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ پیامِ اقبالؒ کا تجزیہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے لیکن یہ کام عزم و استقلال کا متقاضی ہے اور جوئے شیر لانے کے مرادف! تاہم محترم پرویزؒ صاحب نے اپنی مایۂ ناز تصنیف "اقبالؒ اور قرآن" میں پیامِ اقبالؒ کے مختلف گوشوں کو جستہ جستہ بیان کر کے اس ضرورت کو ایک حد تک پورا کر دیا ہے۔ طلوعِ اسلام، پیامِ اقبالؒ کو اپنی وسعت کے مطابق عام کرنے کی کوشش کرتا رہے گا کہ یہ قرآنِ کریم کی تفسیر ہے۔ اگرچہ اقبالؒ آج ہم میں موجود نہیں تاہم اُن کی فکر، تابندہ و پائندہ، ہمہ وقت ہمارے ساتھ رہے گی اور ہمیشہ اس امکان کو زندہ رکھے گی کہ ؎

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

قرآنی پاکستان کیسا ہوتا!

۱۵ جنوری ۱۹۶۷ء کی صبح، عید الفطر کی تقریب پر محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

اسلام ایک زندہ نظامِ حیات بننے کے لئے، اپنی آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ یہ وہ شرط ہے جس کے پورا نہ ہوتے سے وہ، دیگر مذاہب کی طرح ایک مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین یعنی نظامِ حیات نہیں بن سکتا۔ (مثلاً) اس نظام کے بنیادی ستون اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں اور اس کا اصل الاصول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔ ہمارے مروّجہ تصورِ اسلام کی رو سے، اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں صرف نماز پڑھنا اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم، غریبوں اور گداگروں کو کچھ پیسے بطور خیرات دے دینا۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے مقصود ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی بات کے لیے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ فرائض ہم انگریز کے عہدِ غلامی میں بھی آزادانہ ادا کر سکتے تھے اور آج بھی بھارت کا مسلمان، بایں ہمہ بے بسی و بے کسی، انہیں اپنے طور پر ادا کر سکتا ہے لیکن قرآن کریم ان کی ادائیگی کے لیے اپنی حکومت کا قیام، لازمی شرط قرار دیتا ہے جہاں کہتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں (یعنی جماعت مومنین) کہ جب انہیں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا اہتمام کریں گے۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا فریضۂ حیات ہوگا۔ یا (مثلاً) مذہبی سطح پر اسلام سے مقصود یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے اور شرک سے مجتنب رہے۔ یعنی غیر اللہ کی پرستش نہ کرے۔ اس مقصد کے لیے بھی اپنی آزاد مملکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر مقام پر، ہر حال میں کیا جا سکتا ہے لیکن قرآن کریم میں ہے کہ دین کے تمکّن کے لیے استخلاف فی الارض ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ خدا کی عبودیت اختیار کی جا سکتی ہے اور نہ شرک سے اجتناب ممکن ہے۔ سورہ نور میں ہے کہ خدا نے تم سے حکومت کا وعدہ کر رکھا ہے تاکہ تم اس کی عبودیت اختیار کر سکو اور شرک سے بچ سکو۔ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْـًٔا (۲۴/۵۵)۔ جب رسول اللہ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو قبیلہ بنی عامر کا ایک بہت بڑا سردار آپ کے پاس آیا اور اس دعوت کے

مقاصد کے مطابق وضاحت چاہی۔ آپ کی وضاحت پر اس نے پوچھا کہ اگر میں ان امور پر کاربند ہو گیا تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ جنت۔ یعنی باغ و بہار جنت۔ ہمیشہ رہنے والی زندگی۔ اس نے کہا کہ یہ بعد کی بات ہے۔ میں یہاں کے متعلق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ — **نعم النصر و التمکین فی البلاد** اس دنیا میں فتوحات اور حکومت حاصل ہو گی۔ (الکامل)

اسلام کا تقاضا

یہ تھا اسلام کے دین (یعنی زندہ نظامِ حیات) بننے کا تقاضا۔ جس کے پیشِ نظر علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:۔

اس سے اسلام، اپنی تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے گا۔ اور انہیں عصرِ حاضر کی روح کے قریب تر لانے کے قابل بنا سکے گا۔ (خطبہ الہ آباد۔ ۱۹۳۰ء)

اس سے بھی پہلے، انہوں نے اپنے خطبات میں اس حقیقت کی وضاحت کر دی تھی کہ:۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زماں و مکاں کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔

اس مملکت میں، عبادت نام ہوتا ہے قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے کا، اور شرک سے مفہوم ہوتا ہے انسانوں کے خود ساختہ احکام و قوانین کی اطاعت۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مقصود ہوتا ہے ایک ایسے معاشرہ کا قیام جس میں تمام افرادِ معاشرہ، ان قوانین کا از خود، بہ طیبِ خاطر، اتباع کرتے جائیں[1]۔ اور ایتائے زکوٰۃ سے مفہوم ہوتا ہے تمام افرادِ معاشرہ (بلکہ عالمگیر انسانیت) کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا۔ اس میں امر بالمعروف کے معنی ہوتے ہیں ان احکام و ضوابط کا نافذ کرنا جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے قانوناً روکنا جنہیں وہ مذموم قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ

اسلام تخت و تاج سے وفاشعاری کا مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ صرف خدا (کے قوانین) سے عہدِ وفا استوار کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ (خطبات)

اور قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ:۔

اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین

---

[1] اجتماعاتِ صلوٰۃ اسی نظام کا ایک گوشہ اور اسی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں۔

کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔ (حیدر آباد دکن ۱۹۴۱ء)

یہ ہے ایک اسلامی مملکت کی تخلیق و تشکیل کی وجہ جواز، اور یہ تھی وہ بنیاد جس پر مطالبہ پاکستان کی عمارت استوار کی گئی تھی اور جس کے لیے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا۔

لوحِ سادہ

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ نبی اکرمؐ نے جب اسلام کی انقلابی دعوت پیش کی تو اس میں مخالفین کے ساتھ، سب سے بڑی وجۂ نزاع اور سب سے شدید سببِ تصادم کیا تھا؟ انہیں زندگی کے اس نظامِ نو کی طرف دعوت دی جاتی تھی اور وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ ـــ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ۔ (۴۳/۲۲)۔ ہم اس نئے نظام کو اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہم اُسی مسلک پر چلتے رہنا چاہتے ہیں جو ہمارے اسلاف سے ہم میں متوارث چلا آرہا ہے۔ ہم انہی کے نقوشِ قدم کا اتباع کریں گے ہم اپنی روایاتِ کہنہ کو نہیں چھوڑنا چاہتے۔ اُن سے، اس کے جواب میں کہا جاتا کہ ـــ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ۔ (۴۳/۲۴)۔ جو کچھ تمہارے سامنے پیش کیا جاتا ہے اگر یہ اس سے بہتر ہو جس پر تم اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں چلے جا رہے ہو، تو کیا تم پھر بھی اپنے اسلاف کے مسلک ہی کو ترجیح دو گے؟

.... وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں! ہم اُسی مسلک کا اتباع کریں گے۔ ہمیں کسی نظامِ نو کی ضرورت نہیں ـــ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ (۵/۱۰۴)۔ یہ مسلک ہمارے لیے ہر اعتبار سے کافی ہے، یہ تھی وہ بنیادی کشمکش جو اس قدر شدید تصادمات کا موجب بنی۔ جب ان مخالفین نے دیکھا کہ یہ نظام زور پکڑتا جا رہا ہے تو انہوں نے چاہا کہ اس سے کچھ مفاہمت کی صورت نکل آئے۔ یعنی کچھ باتیں اس نظامِ جدید کی لے لی جائیں اور کچھ ان کے مسلکِ آباء کی۔ اور دونوں کے امتزاج سے ایک نظام وضع کر لیا جائے۔ لیکن دین کے نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا شرک ہوتا اس لیے رسول اللہؐ سے بتاکید کہہ دیا گیا کہ ـــ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ دیکھنا! ان لوگوں کی طرف ذرا سا بھی جھک نہ جانا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ تمہاری جماعت بھی اسی عذاب میں گرفتار ہو جائے گی جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں اور جس سے نکالنے کے لئے انہیں اِس نظام کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔

لہٰذا، ایک قرآنی مملکت کی تشکیل کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ ان تمام نظریاتِ حیات و تصوراتِ زندگی، ان

تمام روایاتِ کہنہ اور مسالکِ قدیمہ کو الگ کرکے رکھ دیا جائے جو اس قوم میں متوارث چلے آرہے ہیں۔ اس مملکت کا بنیادی پتھر، لا الٰہ الاّ اللہ ۔ ہے۔ اس میں لا آلٰہ کے معنی یہ ہیں کہ تمام متوارث تصوّرات کو الگ کرکے، ہر شے کا ازسرِنو جائزہ لیا جائے۔ اس کے بغیر، اس جدید نظام کی عمارت (جس کی بنیاد الاّ اللہ پر استوار ہوتی ہے) قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ؎

ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند　　　اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

اسلام میں "بت پرستی" کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ بت تو فارسی زبان کا لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اس کے لیے —
اَوثَان کا لفظ آیا ہے جو وَثَن کی جمع ہے۔ اور وثن کے معنی ہوتے ہیں جمود، تعطّل، عدمِ حرکت۔ جامد و غیر متحرک ہو جانا۔
اس بنیادی مفہوم کے اعتبار سے ہر وہ تصوّر یا نظام جس میں حرکت نہ رہے اور جامد ہو جائے "وَثَن" ہے۔ جب قرآنی ضابطۂ حیات کو عملی شکل دے دی جائے، تو اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ "حرکتِ پیہم" کے معنی یہ ہیں کہ وہ معاشرہ قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے زمانہ کے بدلتے اور بڑھتے رہنے والے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ یوں یہ نظام ایک زندہ تحریک (DYNAMIC MOVEMENT) کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اگر یہ کسی ایک مقام پر رک جائے۔ اس میں جمود پیدا ہو جائے تو یہ وثنیت ہوگی۔ یہ وہ وثن (بت) ہے جس کی پرستش وہ قومیں کرتی ہیں جن پر ذہنی جمود اور عملی تعطّل چھا چکا ہو۔ حیرت ہے کہ ہم نے قرآنِ کریم کے اس عظیم نکتہ کو پسِ پشت ڈال دیا اور مغرب کے مفکّرین کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ چنانچہ "وہائٹ ہیڈ" لکھتا ہے کہ

> بت پرستی کی کنہ و حقیقت مروّجہ خداؤں پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا ہے [۱]

اس قسم کی بت پرستی میں، ایک زندہ اور متحرک نظامِ حیات کے تصوّرات و مناسک کی محض شکلیں باقی رہ جاتی ہیں۔ ان کے معانی و مفہوم ختم ہو جاتے ہیں۔ مذہب، دین کی ممّی شدہ لاش ہوتا ہے۔ ان بے روح رسوم اور بے جان معتقدات سے چپکے رہنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کے متعلق وہائٹ ہیڈ لکھتا ہے کہ۔

> زندگی کے بے جان پیکروں کے ساتھ چپکے رہنے کا نتیجہ سست رفتار زوال ہوتا ہے۔ جس میں ان رسوم کو بلا نتیجہ دہرایا جاتا ہے...... اس سے تہذیب و ترقی کا محض سراب باقی رہ جاتا ہے حقیقت غائب ہو جاتی ہے [۲]

انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوان، بلا سوچے سمجھے اور بلا اختیار و ارادہ اپنے اسلاف کے

[۱] A.N. WHITEHEAD — ADVENTURE OF IDEAS — P.12.

[۲] ایضاً۔ P.358

مسلک پر چلے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں آگے بڑھنے اور کچھ اور بننے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ بکری کا بچہ بکری ہی بن سکتا ہے۔ اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے ادوار آتے رہے جن میں تقلید کی ان برفانی سلوں کو توڑ کر کاروانِ انسانیت کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کا انسان بھی، اپنے اسلاف کی طرح، غاروں میں پڑا زندگی بسر کرتا۔ یاد رکھیئے۔ جوہر زندگی کی نمود، اپنے اختیار و ارادہ اور فکر و بصیرت سے، تعمیری کام سرانجام دینے سے ہوتی ہے۔ اگر وہ کام جنہیں عام طور پر نیکی کہا جاتا ہے محض تقلیداً کیے جائیں، تو یہ انسانی زندگی میں نشو و ارتقاء کا موجب نہیں بن سکتے۔ انسانی زندگی میں (MORAL) تو خیر بڑی چیز ہے، اس میں (IMMORAL) ہونا اتنا تباہ کن نہیں جتنا ہلاکت آفریں (AMORAL) ہونا ہے۔ تقلید میں انسان (AMORAL) ہو جاتا ہے۔

یہی وہ جمود ہے جسے توڑنے کے لیے اقبال کہتا ہے کہ۔۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش
براہِ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دستِ تو کارے نادر آید!
گنا ہے ہم اگر باشد ثواب است

قرآنِ کریم نے، جس کا جشنِ نزول منانے کے لیے ہم آج جمع ہوئے ہیں، اپنا تعارف کراتے یا یوں کہیے کہ اپنے نزول کا مقصد بتاتے ہوئے کہا ہے کہ۔۔ اِنَّآ اَنزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ۔ (۹۷/۱) یعنی قرآن دنیا میں نئی اقدار لایا ہے۔ اس کی آمد سے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے تمام قدیم پیمانے الٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ ان نئے پیمانوں نے لے لی ہے۔ قرآن کی اولین مخاطب قوم کی طرف سے جو اس کی مخالفت ہوتی تھی تو اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے قدیم پیمانوں کو، جو ان کے اسلاف کی طرف سے متوارث چلے آرہے تھے، ان جدید پیمانوں سے بدلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اقبالؒ نے جب پاکستان کا تصوّر دیا تھا تو اس مملکت کو وجود میں لانے کا مقصد یہ بتایا تھا کہ۔

اس سے اسلام کو ایسا موقعہ میسّر آجائے گا جس سے یہ اس ٹھپّہ کو مٹا سکے گا جو عرب ملوکیت نے زبردستی اس پر لگا رکھا ہے۔ (خطبہ الٰہ آباد)

روشِ کہن ہمارا مروّجہ مذہب، ہماری شریعت، ہمارا کلچر، ہماری روایات، ہمارا فلسفۂ حیات، ہمارے رسوم و مناسک، غرضیکہ ہر وہ شے جسے ہم اس وقت عام طور پر اسلامی کہہ کر پکارتے ہیں، عرب ملوکیت کے دور کی پیدا کردہ ہے۔ اقبالؒ نے اس کے لئے "عجمی اسلام" کی اصطلاح وضع کی تھی کیونکہ یہ پیدا تو عرب ملوکیت کے زمانہ (بالخصوص دورِ عبّاسیہ) میں ہوا تھا۔ لیکن تھا عجم سے مستعار لیے ہوئے تصورات کا مجموعہ۔۔

اسی لئے حکیم الامت نے مروجہ اسلام پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

شریعت، طریقت، تصوف، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

پاکستان کی تشکیل سے مقصد ان "بتانِ عجم" کو حریم کعبہ سے نکال کر، اسے خالصۃً "خدا کے گھر" میں تبدیل کرنا تھا۔ یعنی ہمارے ہاں "جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے" اس کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر معاشرہ کو از سرِ نو مستقل اقدار خداوندی کے خطوط پر متشکل کرنا۔

مذہبی پیشوائیت

"بتانِ عجم" کے یہ پجاری ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ آپ کو معلوم ہے (اور قرآن اس حقیقت کو بار بار سامنے لاتا ہے) کہ قرآنی نظام کی دعوت کی شدید ترین مخالفت، اہل کتاب کے مذہبی پیشواؤں کی طرف سے ہوتی تھی۔ مذہبی پیشوائیت، ماضی کی کہنہ اور فرسودہ روایات کے محافظ ہونے کے مقدس سہاروں سے قائم رہتی ہے اور ان روایات کے ختم ہو جانے سے ان کا اپنا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ وہ روایات کو زندہ اس لیے رکھنا چاہتے ہیں، کہ ان کی زندگی سے خود ان کی اپنی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ ورنہ انہیں ان روایات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ؛ ؎

حکایتِ قدِآں یار دلنواز کنم
بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

قرآنی نظام میں جب یہ فرسودہ روایات ہی باقی نہیں رہتیں تو اس میں مذہبی پیشوائیت کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو نبی اکرمؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں مذہبی پیشوائیت کا نام تک نہیں ملتا۔ اُس نظام میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر حکومت کا فریضہ تھا جو قرآنی معروفات کو قانوناً نافذ کرتی اور اس کے برعکس اقدامات کو قانوناً روکتی تھی۔

اگر قرآنی پاکستان میں، زندگی کو ایک لوحِ سادہ (CLEAN SLATE) سے شروع کیا جاتا جس میں فرسودہ عجمی تصورات کی قبروں کے مجاوروں کے لیے کوئی گنجائش نہ ہوتی اور ملتِ پاکستانیہ، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اُن الفاظِ گرامی کو پورے حزم ویقین اور کامل وثوق واعتماد کے ساتھ، ببانگِ دُہل دنیا کے سامنے دہراسکتی جنہیں آپ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا تھا کہ

الا — کل شئی من امر جاھلیۃ تحت قدمی موضوع

ہاں! زمانہ جاہلیت کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے پامال ہیں۔

تو قرآنی پاکستان، اس عظیم انقلابی اعلان کی نشرگاہ ہوتا۔ اسی کے لیے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

وقت آنست کہ سامانِ سفر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

حاکم و محکوم کا امتیاز

قرآنی مملکت میں، حاکم و محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ امت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (۳/۱۱۰) تم بہترین امت ہو جسے ہم نے نوعِ انسان کی بہبود کے لیے متشکل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق، مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ تقسیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ الدین یعنی قرآنی نظام کی خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ۔ (۸۲/۱۹)۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حق حکومت رکھے، نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔ اس میں تمام معاملات قوانینِ خداوندی کے مطابق طے پاتے جائیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ كُونُوا عِبَادًا لِي۔ (۳/۷۹) تم میرے محکوم ہو جاؤ۔ نہ کسی کا کوئی محکوم نہ محتاج۔ اقبال کے الفاظ میں ؂

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں، این است و بس

جب عہدِ فاروقیؓ میں روم کا سفیر مدینہ آیا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کون ہے، تو صحابہ کی طرف سے اس کا جواب یہ ملا تھا کہ — ما لنا ملك - بل لنا امیر — ہمارا بادشاہ کوئی نہیں صرف امیر ہے۔ واضح رہے کہ لفظ امیر کے بنیادی معنی مشورہ کرنے والے یا راہ نمائی کرنے والے کے ہیں۔ امت جس شخص کے سپرد یہ امانت کرتی ہے، اس کا فریضہ کیا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق امت کے سب سے بڑے منتخب کردہ امیر، صدیقِ اکبرؓ نے اپنے پہلے خطبۂ خلافت میں، ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی کہ:-

یاد رکھو! تم میں سے ہر کمزور، طاقت ور ہے، جب تک میں اس کا حق نہ دلاؤں۔ اور ہر طاقت ور کمزور ہے جب تک اس سے کمزور کا حق نہ لے لیا جائے۔

اس فریضہ کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں دہرایا تھا کہ

یاد رکھو! اگر کوئی شخص کسی پر زیادتی کرے گا تو میں اس وقت تک اسے نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر پاؤں نہ ٹکا دوں۔ تا آنکھ وہ حق کے سامنے سرانداز ہو جائے۔ لیکن تم میں سے حقدار کے لیے میں اپنا رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

خلافت اور ملوکیت میں فرق

وہ اکثر لوگوں سے دریافت کرتے رہتے کہ میں کہیں خلافت سے روگردانی کر کے، بادشاہت کی طرف تو نہیں جا رہا؟ ایک دفعہ جب انہوں نے یہی سوال دہرایا تو ایک شخص نے جواب میں کہا کہ خلافت اور بادشاہت کا فرق بڑا نمایاں ہے اس لیے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارے ہاں خلافت ہے یا بادشاہت۔ خلیفہ تمام افرادِ معاشرہ کے حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔ اور بادشاہ ان کے حقوق میں ظلم اور جبر کرتا ہے۔ وہ ایک طرف سے لوٹتا ہے اور دوسری طرف (اپنے مقاصد کے لیے) خرچ کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔

انہوں نے اپنے پہلے خطبہ میں کہا تھا کہ:۔

لوگو! میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں، میں ان کی وضاحت کرتا ہوں۔ تمہارا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ تمہارے اموال میں سے کوئی چیز نہ لوں مگر قانونِ خداوندی کے مطابق، اور جو کچھ لوں، اس میں سے کچھ خرچ نہ کروں مگر حق کے مطابق۔

اور یہ بھی کہا تھا کہ

تمہارا مجھ پر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو جاؤ تو میں ان بچوں کا باپ بنوں۔

وہ کہا کرتے تھے کہ میری اور دیگر افرادِ معاشرہ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پارٹی سفر کے لیے نکلے تو سب لوگ اپنے پیسے ایک شخص کے سپرد کر دیں کہ وہ سفر کے سلسلہ میں ضروری اخراجات کرتا جائے اور اس کا حساب رکھے ــــ لہٰذا مسلمانوں کے مال میں میرا حصہ اتنا ہی ہے کہ کپڑوں کے دو جوڑے ایک گرمی کا اور ایک سردی کا ــــ اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لیے اتنا کھانا جو قریش کے عام آدمی کی خوراک ہے۔

بیوی بچے فتنہ نہ بن جائیں

اہل و عیال کے معاملہ میں ایک طرف قرآن نے انہیں زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ (۱۸/۴۶) کہا ہے۔ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک (قُرَّةَ اَعْیُنٍ۔ ۲۵/۷۴) کا موجب قرار دیا ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی بتا دیا ہے کہ یاد رکھو۔ اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸/۲۸) یہ انسان کے لیے بہت بڑی آزمائش کا موجب بن جاتے ہیں اور مقاصدِ حیات میں تمہارے سب سے بڑے

إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ (۶۴/۱۴)۔ یاد رکھو! تمہاری اور بیویاں بعض اوقات تمہاری سب سے بڑی دشمن ہوتی ہیں"۔ تمہاری زندگی کے بڑے بڑے بلند مقاصد انہی ہاتھوں تباہ ہوتے ہیں ان کی وجہ سے تمہارے پاؤں میں ایسی لغزش آتی ہے کہ تم اپنے مقامِ بلند و رفیع سے گر کر چور ہو جاتے ہو۔ اس لئے فَاحْذَرُوهُمْ ان سے بہت محتاط رہنا۔ قرآنی مملکت میں اس لغزش کی گھاٹی پیشِ نگاہوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی ایک بیوی تھی جسے ان کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جب امورِ خلافت آپ کے سپرد ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ امورِ مملکت میں دخیل ہوتی ہے اور بعض اوقات غلط سفارشات کر دیتی ہے۔ جب اس نے تنبیہہ کے باوجود اپنی اس عادت کو نہ بدلا تو آپ نے اُسے طلاق دے دی۔ اولاد کے بارے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ عراق کے گورنر (حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) نے ان کے دو لڑکوں (جناب عبداللہ اور عبید اللہ) کو کچھ رقم خزانہ میں داخل کرنے کے لیے دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ہم اس رقم کو قرض سمجھ کر اس سے تجارت کریں اور پھر اصل رقم بیت المال میں جمع کرا دیں تو اس کی اجازت ہے؟ انہوں نے اجازت دے دی۔ جب حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ اس مال کی تجارت سے جو منافع ہوا ہے وہ بھی بیت المال میں داخل کرنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ گورنر نے انہیں اس کی اجازت دے دی تھی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ اس نے کسی اور کو بھی اس قسم کی اجازت دی تھی؟ یا تمہارے ہی ساتھ یہ رعایت برتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ کسی اور کو تو اس قسم کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اس پر آپؓ نے کہا کہ اس نے یہ رعایت تمہیں امیرالمومنین کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دی ہے اور یہیں سے فساد کی ابتدا ہوا کرتی ہے۔ قرآنی مملکت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے میں اپنے فیصلے کو واپس نہیں لینا چاہتا۔۔۔ اس باب میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب وہ امہات المومنینؓ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات) کو بیت المال سے کوئی چیز بطور تحفہ بھیجتے تو حضرت حفصہؓ کا حصہ آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کچھ کمی رہ جائے تو وہ ان کے حصہ میں ہو۔ یہ اس لیے کہ حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں۔۔۔ قحط کے زمانے میں آپ نے گلی میں ایک بچی کو دیکھا کہ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ آپ کو اس سے بڑا صدمہ ہوا۔ کہا کہ کوئی پہچانتا ہے کہ یہ بچی کون ہے؟ بیٹا ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ یہ آپ کی پوتی (فلاں) ہے۔ آپ نے کہا کہ اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے۔ اس نے کہا کہ قحط کی وجہ سے جتنا کچھ ملتا ہے اس میں یہ حالت نہ ہو گی تو اور کیا ہوگا۔۔۔ آپؓ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا کہ پھر جو حال قوم کے دوسرے بچوں کا وہی عمرؓ کی پوتی کا ہوگا۔ تنگی ہو گی تو سب پر۔ اور کشادگی ہو تو سب کے لیے۔۔۔ ان کا دستور تھا کہ

> جب مملکت میں کوئی امتناعی حکم نافذ کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے اور "لوگ تمہاری طرف ایسے دیکھ رہے ہیں جیسے پرندے گوشت کی طرف۔

اگر تم محتاط رہو گے تو وہ بھی رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا تو (اس وجہ سے کہ تمہارے اعمال کا اثر دوسروں پر بھی ہوتا ہے۔) تمہیں اُن کی دُگنی سزا دوں گا۔ اب تمہارا اختیار ہے۔ چاہے آگے بڑھو اور چاہے پیچھے ہٹو۔

(تاریخ عمر۔ ابن جوزی)

عدل

قرآنی مملکت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر ایک سے عدل ہوتا ہے۔ عدل کی ایک شکل یہ ہے کہ ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے اور اس میں کسی کی رُو رعایت نہ کی جائے۔ یہی ہے وہ مملکت جس میں ہر صاحبِ اختیار سے یہ کہا جاتا ہے کہ — اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ - فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (۳۸/۲۶) تمہیں مملکت میں صاحبِ اختیار اس لیے بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کے فیصلے حق کے ساتھ کرو اور اس میں اپنے جذبات کو کبھی دخیل نہ ہونے دو۔

یہاں کہا گیا ہے کہ لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ حق کے ساتھ کرو۔ یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ عدل کا عام تصور یہی ہے کہ اگر معاملات کا تصفیہ ملک کے رائج الوقت قانون کے مطابق ہو تو کہا جائے گا کہ عدل کا تقاضا پورا ہو گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خود وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ ہوا ہے، عدل پر مبنی نہیں ہو گا تو اس کے مطابق فیصلہ کو مبنی بر عدل کیسے کہا جائے گا؟ اگر قانون کے استعمال میں جذبات اثر انداز ہو سکتے ہیں تو قانون سازی میں جذبات کیوں اثر انداز نہیں ہو سکتے! یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس میں تمام قوانین، اصولی طور پر خدا کے متعین فرمودہ (قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ) ہوتے ہیں اور مملکت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ العمل بنائے۔ قرآن کریم کا تعارف، سب سے پہلی آیت میں، الکتاب کہہ کر کرایا گیا ہے۔ الکتاب ضابطہ قوانین کو کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں چند ایک قوانین تفصیلی طور پر دیئے گئے ہیں اور باقی تمام قوانین اصولی طور پر درج ہیں۔ ان اصولی قوانین کی جزئیات، ہر زمانے کی امت، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے مرتب کرے گی۔ ان جزئیات، (یا بائی لاز) میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ لیکن اصولی قوانین ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔ ان میں تبدیلی کا حق کسی ایک فرد یا پارلیمان تو ایک طرف، ساری دنیا کی آبادی کو بھی حاصل نہیں ہو گا۔ جو مملکت قرآنی قوانین کے مطابق فیصلے کرے گی اسے اسلامی مملکت کہا جائے گا۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ - (۵/۴۴)

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا، قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں، نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات و میلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی مؤثرات دخیل کار۔

يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲/۴۸)

اُس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آ سکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی، نہ ہی اس سے کچھ لے لوا کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دُور سے پہچانا جا سکتا ہے — يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ (۵۵/۴۱) اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے"۔ اس میں انتظام ایسا ہوتا ہے کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں گے — وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (۳۶/۵۹) تاکہ کوئی ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم، مواخذہ سے بچ جائے، یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے —

لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا (۶/۱۶۵)۔ اس میں ہر شخص اپنے اعمال کیمطابق بدلہ پاتا ہے — وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۵) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں، بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔ اس باب میں اور تو اور، خود حضورؐ رسالتمآبؐ کی زبان اقدس سے بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ

إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اسکے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔

اور اس کے بعد فرما دیا کہ اگر میری چہیتی بیٹی — فاطمہؓ — بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے، ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہیے تھی، پرائیویٹ مکان میں دی ہے، تو آپ نے بیٹے کو بلوا کر، اسے از سر نو پبلک میں سزا دی — جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو، تو آپ نے، گورنر، اس کے بیٹے، اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔ مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اُسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سمایا ہوتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے

جو خدا کی طرف سے نازل کردہ کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

۲۔ قرآنی مملکت میں ہر فیصلہ قرآنی قوانین کے مطابق ہوتا ہے اور ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے میں، نہ فیصلہ کرنے والے کے ذاتی رجحانات و میلانات اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی قسم کے خارجی مؤثرات دخیل کار۔

يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲/۴۸)

اُس دور میں کوئی شخص (قانون کے مقابلہ میں) کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آ سکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش مجرم کو بچا سکے گی، نہ ہی اس سے کچھ لے لوا کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی کسی اور طرح مجرم کی مدد کر سکے گا۔

اس میں مجرم چھپا نہیں رہ سکتا، دُور سے پہچانا جا سکتا ہے — يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ (۵۵/۴۱) اس میں مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے"۔ اس میں انتظام ایسا ہوتا ہے کہ مجرم، شریف انسانوں سے بالکل الگ نظر آئیں گے — وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ (۳۶/۵۹) تاکہ کوئی ایسے لوگوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ اس میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی مجرم، مواخذہ سے بچ جائے، یا کوئی بے گناہ یونہی دھر لیا جائے —

لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا (۶/۱۶۵)۔ اس میں ہر شخص اپنے اعمال کیمطابق بدلہ پاتا ہے — وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۵) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

قرآنی مملکت میں، بڑی سے بڑی شخصیت بھی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہوتی۔ اس باب میں اور تو اور، خود حضورؐ رسالتمآبؐ کی زبان اقدس سے بھی یہ اعلان ہوتا ہے کہ

إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (۶/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اسکے مواخذہ سے سخت ڈرتا ہوں۔

اور اس کے بعد فرما دیا کہ اگر میری چہیتی بیٹی — فاطمہؓ — بھی قانون شکنی کرے تو میں اسے بھی سخت سزا دوں گا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ مصر کے گورنر نے، ان کے بیٹے کو وہ سزا جو پبلک کے سامنے دینی چاہیے تھی، پرائیویٹ مکان میں دی ہے، تو آپ نے بیٹے کو بلوا کر، اسے از سرِ نو پبلک میں سزا دی — جب اسی مصر کے گورنر کے بیٹے نے ایک مصری کو کسی بات پر یہ کہہ کر ہنٹر سے پیٹا کہ تم بڑے آدمیوں کی اولاد سے گستاخی سے پیش آتے ہو، تو آپ نے، گورنر، اس کے بیٹے، اور اس مصری کو مدینہ بلوا بھیجا۔ مصری کے ہاتھ میں ہنٹر دیا اور کہا کہ اسے اُسی طرح مارو اور کہو کہ تم نے دیکھ لیا کہ بڑوں کی اولاد کا حشر کیا ہوتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اس گورنر کو بھی تادیب کی کہ اگر تم نے بیٹے کی تربیت صحیح کی ہوتی تو اس کے سر میں یہ خناس کیوں سمایا ہوتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے اس لئے اسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے

عوام میں اس وقت تک ٹیڑھ پیدا نہیں ہوتی جب تک ان کے لیڈر سیدھے رہتے ہیں جب تک راعی اللہ کی راہ میں چلتا ہے، رعایا اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ جہاں اس نے پاؤں پھیلائے، رعایا اس سے پہلے پاؤں پھیلا دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنی مملکت میں، امیر کی اطاعت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے۔ قرآنِ کریم نے اس باب میں واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ۔ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا۔ جو ہمارے قوانین کو فراموش کردے۔ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ۔ اور اپنے مفاد اور جذبات کے پیچھے لگ جائے۔ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (۱۸/۲۸) اور یوں اس کے معاملات قاعدے اور قانون کی حدود کی تجاوز کر جائیں، تو اس کی اطاعت مت کرو۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ

اگر ایک ناک کٹا، سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر ہو تو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے، تم اس کے حکم کو سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ (مسلم)

اسی اصول کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبہ صدارت میں، ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ۔

تم میری اطاعت اس وقت تک کرو جب تک میں اللہ کے احکام کی اطاعت کروں۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔

اور حضرت عمرؓ نے اسے ان الفاظ میں دہرایا تھا۔ کہ

یاد رکھو! کوئی صاحبِ اختیار دنیا میں اس مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا کہ وہ اگر خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے تو اس کی اطاعت کی جائے۔

یہ اس لیے کہ قرآنی مملکت میں اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوتی ہے، کسی انسان کی نہیں۔ ان کا امیر ان قوانین کے مطابق معاشرہ متشکل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ خود ہی ان قوانین کی اطاعت نہ کرے تو دوسرے اس کی اطاعت کس طرح کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے داعیٔ اوّل ـــ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ سب سے پہلے میں خود اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔

اس مقام پر اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ امیر کی اطاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ایک کو اس کا اختیار دے دیا جائے کہ جس وقت وہ سمجھے کہ امیر نے خدا کے کسی حکم کی اطاعت نہیں کی، وہ بغاوت کے لیے اُٹھ کھڑا ہو۔ اس سے تو انارکی پھیل جاتی ہے۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ قرآنی مملکت میں آئین میں اس قسم کا ضابطہ ہوگا جس کی رُو سے خود امیرِ مملکت کے اقدامات پر نگاہ رکھی جائے گی اور جونہی وہ حد سے تجاوز کرے، آئینی اور قانونی طور پر اس کا مواخذہ ہو سکے گا۔ اور اگر وہ

مجرم ثابت ہوگا تو اس کی جگہ دوسرا امیر مقرر کر دیا جائے گا۔

سوشل جسٹس

یہ تھا عدل — یعنی قانون کے مطابق چلنے کا ایک گوشہ — اس کا دوسرا گوشہ وہ ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں عدلِ عمرانی (SOCIAL JUSTICE) کہا جاتا ہے۔ سوشل جسٹس کی اصطلاح آجکل بڑی عام ہو رہی ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا سنائی دے گا۔ لیکن اس اصطلاح کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ابھی تک متفق علیہ کچھ نہیں کہا گیا۔ یہ اصطلاح بھی، سوشلزم کی طرح، ہر ذہن میں الگ مفہوم کی حامل ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس سوسائٹی کو مبنی برعدل (JUST) کہا جائیگا جس میں ہر فرد کو وہ کچھ مل جائے جس کا وہ حقدار ہے۔ لیکن یہیں سے پھر دوسرا سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کس طرح متعین کیا جائے کہ کوئی شخص کسی چیز کا حقدار ہے۔ مختلف افراد کے حق یا واجب (DUE) کا تعین پہلے سوال سے بھی زیادہ مشکل ہے اور اسی سے ساری پیچیدگیاں ابھرتی ہیں۔ ایک طرف سے جواب ملتا ہے کہ ایک شخص صرف اس کا حقدار ہے جو اسے معقول اخلاقی اصولوں (VALID MORAL PRINCIPLES) کے مطابق ملے۔ لیکن یہ اخلاقی اصول کیا ہیں، یہ سوال پھر بحث طلب رہ جاتا ہے۔ اس موضوع پر جو کچھ اس وقت تک میری نظر سے گزرا ہے، اس میں (EMIL BRUNNER) کا پیش کردہ مفہوم میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ۔

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی برعدل (JUST) اور فلاں ظلم پر مبنی (UNJUST) ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات رسوم و رواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جا سکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لیے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی میناکاری اور ملمع سازی ہوگی۔ (JUSTICE AND THE SOCIAL ORDER)

رزق کا حق

قرآن کی رُو سے عدل کی تعریف اسی قسم کی ہے۔ یعنی کسی شخص کو وہ کچھ مل جانا جس کا وہ، از روئے قوانینِ خداوندی، حقدار ہے، عدل کہلائے گا۔ اور یہ قوانین، قرآن کے اندر موجود ہیں۔ لہٰذا، قرآن کی رُو سے سوشل جسٹس کے معنی ہونگے، ہر شخص کو اس کا قرآنی حق ادا کر دینا۔ قرآنی مملکت

اس تحریک سوشل جسٹس کو عملاً بروئے کار لانے کی ایجنسی ہے۔ ان ابدی اور غیر مشروط حقوق میں قرآن نے سب سے پہلے ہر ذی حیات کے لیے رزق کا حق شامل کیا ہے۔ رزق کے معنی ہیں تمام وہ سامان اور ذرائع جن سے انسان کی جسمانی پرورش اور اس کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ اس حق کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (11/6)

سطحِ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

قرآنی مملکت، جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے، خدا کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کا فریضہ اپنے اوپر لیتی ہے۔ اس لئے تمام افرادِ معاشرہ سے واضح الفاظ میں کہتی ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔ (6/152)

(تم مطمئن ہو کر بلند مقاصدِ حیات کے حصول کے لیے کوشاں رہو) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

ہمارے ہاں یہ بحث اکثر وجہِ نزاع بنی رہتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ وہ سرمایہ دارانہ ہے، رفاہی ہے، یا اشتراکی ــــ لیکن ہم اگر قرآنی مملکت کی اس عظیم ذمہ داری کو سامنے رکھیں جسے مندرجہ بالا آیت میں متعین کیا گیا ہے، تو بات نکھر کر سامنے آجاتی اور سارا مسئلہ صاف ہو جاتا۔ اسلام میں معاشی نظام کا انداز کچھ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ مقصود بالذات نہیں، سوال سارا یہ ہے کہ وہ ذمہ داری جسے مملکت اپنے سر پہ لیتی ہے وہ کس طرح کے معاشی نظام سے پوری ہو سکتی ہے ــــ یعنی تمام افرادِ معاشرہ اور ان کی اولاد کے سامانِ زیست کی ذمہ داری ــــ اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما فراہم کرنا۔ اور جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے یہ قرآنی مملکت کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔ ظاہر ہے کہ مملکت اتنی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو نہیں سکتی جب تک رزق کی پیداوار کے ذرائع اس کی تحویل میں نہ ہوں۔ رزق کی پیداوار کا بنیادی ذریعہ، زمین ہے۔ اور قرآن کی رُو سے زمین پر ــــ جو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ، انسانوں کی پرورش کے لیے عطا ہوئی ہے ــــ انفرادی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــ اسے قرآن نے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ (41/10) قرار دیا ہے یعنی اسے تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں طور پہ کھلا رہنا چاہیئے۔ کسی کی ملکیت میں نہیں چلا جانا چاہیئے۔ اسی حقیقت کو نبی اکرمؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لیے رہنی چاہیئے۔

اس سلسلہ میں آپؐ نے پہلا اصلاحی قدم یہ اٹھایا کہ زمینداری کے نظام کو ختم کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ زمین کاشتکار کے پاس رہے گی اور وہ بھی اتنی جتنی وہ خود کاشت کر سکے۔ اس کے بعد، جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق کی وسیع و عریض زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو ان کی تقسیم کے سوال پر اچھی طرح بحث ہوئی اور بالآخر یہ فیصلہ

ہوا کہ انہیں افراد میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ چنانچہ مملکت کی طرف سے اعلان کر دیا گیا کہ لَنَا رِقَابُ الْاَرْضِ ـــ زمین مملکت کی رہیگی۔

ربٰو کا مفہوم

زمین کی ملکیت یا تحویل کے بعد، سب سے اہم سوال، حصولِ دولت کا ہے۔ عصرِ حاضر میں معیشت کا یہ مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ معاوضہ محنت (LABOUR) کا ہونا چاہیے یا سرمایہ (CAPITAL) کا۔ اور جس انداز سے اس سوال پر بحث ہوتی ہے۔ اس سے ایسا نظر آتا ہے گویا یہ سوال دنیا کے سامنے پہلی مرتبہ آیا ہے حالانکہ اربابِ فکر و نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ قرآن کریم نے اس سوال کو مدت ہوئی، حل کر کے رکھ دیا تھا۔ قرآن نے ربٰو کو حرام قرار دیا ہے۔ اور حرام بھی اس شدت کا کہ اس کے لیے کہا ہے کہ ایسا کرنا خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ ربٰو کا ترجمہ ہمارے ہاں سود کیا جاتا ہے ـــ اور اس ترجمہ کی بنا پر یہ بحثیں چل نکلی ہیں کہ تجارتی سود (COMMERCIAL INTEREST) اور بنکوں کا سود وغیرہ جائز ہے یا نہیں۔ آپ ذرا اس حقیقت پر غور کیجئے کہ قرآن نے ربٰو کے علاوہ اور بھی بہت سی باتوں کو حرام قرار دیا ہے لیکن ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس، ربٰو کی یہ کیفیت ہے کہ اسے حرام قرار دیتے ہوئے کہا کہ ـــ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا ـــ ربٰو میں سے جو کچھ کسی کے ذمے باقی ہے اسے چھوڑ دو۔ اور اس کے بعد کہا کہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (۲/۲۷۹) اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اسے خدا اور رسولؐ (اسلامی نظام) کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھ لو۔ اس سے آپ دیکھئے کہ ربٰو اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے ارتکاب کو نظامِ مملکت کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے ـــ ربٰو کے معنی ہیں "سرمایہ پر بڑھوتی" ـــ (سود تو صرف اس کی ایک شکل کا نام ہے) قرآن جس قسم کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس میں سرمایہ کے معاوضہ کا اصول ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، ربٰو کا مرتکب، اسلامی مملکت کے اس نظام کے علی الرغم دوسرا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مملکت کے نظام کے خلاف دوسرا نظام قائم کرنا کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ اس لیے اسے "خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا قرآنی مملکت میں ایسا نظام جس میں سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، حرام ہی نہیں بلکہ مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ اس میں معاوضہ صرف محنت کا ہوگا، سرمایہ کا نہیں ہوگا خواہ اس کی کوئی شکل ہو۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ (۵۳/۳۹) ـــ یعنی انسان صرف اس کا حقدار ہے جس کے لیے وہ محنت کرے۔ اس کے نظام کا بنیادی اصول ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ پر کچھ وصول ہی نہیں کیا جا سکے گا تو فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کی، جو نظامِ سرمایہ داری کی اصل و بنیاد ہے، کوئی قیمت ہی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضرورت سے زیادہ سب کچھ دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے دے دینے کا حکم دیا ہے۔ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) "تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر دوسروں کے لیے کھلا رکھیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری

ضرورت سے زیادہ ہے، سب کا سب۔ اسی کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث کرتی ہے جس میں حضرت بلالؓ نے کہا کہ

رسول اللہ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھو اور اس میں سے جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اسے مت روکو۔ میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یا تو ایسا کرنا ہوگا یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (حاکم)

دولت کی تقسیم

اس وقت دنیا میں اشتراکی نظام (کمیونزم) کا بڑا شہرہ ہے۔ اس نظام کا سنگِ بنیاد یہ اصول بتایا گیا ہے۔

FROM EACH ACCORDING TO HIS CAPACITY, TO EACH ACCORDING TO HIS NEEDS.

یعنی ہر شخص سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جائے اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جائے۔

اشتراکیت کا یہ اصول اس وقت تک محض ایک نظری اصول ہی ہے۔ اس پر عمل کہیں نہیں ہو رہا۔ جن ممالک کو اس وقت کمیونسٹ کہا جاتا ہے ان میں بھی کمیونزم کا نظام رائج نہیں، سوشلزم کا نظام رائج ہے۔ اسلیے ہنوز کمیونزم کا مندرجہ بالا اصول شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ لیکن اس اصول پر آج سے چودہ سو سال پہلے حجاز کی قرآنی مملکت میں عمل بھی ہو چکا ہے۔ اس میں شروع میں مالِ غنیمت کی تقسیم ہوتی تھی تو اس تقسیم میں رسول اللہ کا دستور یہ تھا کہ آپ غیر شادی شدہ کو ایک حصہ دیتے تھے اور شادی شدہ کو دُوگنا حصہ کیونکہ اس کی ضروریات زیادہ ہوتی تھیں۔ اس کے بعد جب افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دیئے گئے تو ان میں بھی یہی اصول کارفرما رکھا گیا۔ یہ اس لیے کہ تمام افرادِ معاشرہ کو رزق — یعنی سامانِ زیست — مہیا کرنا اس مملکت کا فریضہ تھا اس میں کوئی دوسرا اصول نافذ العمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس مملکت نے ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں کیفیت یہ ہو کہ — اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى۔ (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) نہ کوئی شخص بھوک اور پیاس کی وجہ سے پریشان ہو اور نہ ہی وہ لباس اور مکان سے محروم رہے۔ یہ ہر فرد کی کم از کم بنیادی ضروریات زندگی ہیں جن سے قرآنی مملکت میں کوئی بھی محروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معاشرہ میں صرف انہی بنیادی ضروریات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اور دیگر سامانِ آسائش و زیبائش سے محرومی ہوتی ہے۔ جوں جوں اس معاشرہ میں ترقی ہوتی جاتی ہے اسکا نقشہ جنتی بنتا جاتا ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ — وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ۔ (۲۲/۲۳) نہایت اعلیٰ درجہ کے ریشمی ملبوسات — ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ۔ (۱۸/۳۱) دبیز و لطیف ریشم کے زرکار پردے۔ سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ — مرصع اور نرم و نازک صوفے۔ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ

كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۝ (۷۶/۱۵) — چاندی کے برتن اور بلوریں آبخورے۔ غرضیکہ — نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا (۷۶/۲۰) عظیم مملکت اور اس میں سامانِ آسائش نہایت فراواں۔ اور پھر یہ سامانِ آسائش و آرائش کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص نہیں ہوگا بلکہ ہر فردِ معاشرہ کے لیے یکساں۔ قرآن میں آپ شروع سے آخیر تک دیکھ جائیے اس میں کہیں یہ نہیں لکھا ملے گا کہ جنتی زندگی کی یہ آسائشیں ایک خاص طبقہ کے لیے ہوں گی۔ اور عوام ان سے محروم رہیں گے۔ قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں یہ تمام سامان ہر ایک کو متیسر ہوگا۔ اس میں سب کا معیارِ زندگی اتنا بلند ہوگا۔ جنت کا کوئی گوشہ جہنم نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں آپ عام اخلاقی برائیوں پر غور کیجیے۔ ان کے اوّلین سرچشمے دو ہی نظر آئیں گے۔ یعنی افراطِ زر یا افلاس و نکبت۔ افراطِ زر سے سرکشی یا طغیانی کے فساد انگیز معائب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اور نکبت و افلاس سے پستی و دنائت کے انسانیت کُش عیوب و ذمائم۔ جب قرآنی مملکت کے جنتی معاشرہ میں نہ افراطِ زر ہوگا نہ افلاس و زبوں حالی تو ظاہر ہے کہ اس میں، ان سے پیدا ہونے والے عیوب و ذمائم کا بھی وجود نہیں ہوگا — حسد، کینہ، انتقام، تنگ نظری حرص، ہوس، فریب کاریاں، مکاریاں سازشیں — اور دوسری طرف بے حمیتی، بے غیرتی، ذلتِ نفس، تملق، خوشامد، منافقت وغیرہ، یہ سب عیوب معاشرتی ناہمواریوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ ناہمواریاں مٹ جائیں تو ان وجہِ ننگِ انسانیت بدنہادیوں اور بدلگامیوں کا بھی وجود باقی نہیں رہتا۔ اس معاشرہ کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ — لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا۔ اس میں نہ لغویت اور بیہودہ پن ہوتا ہے، نہ کوئی ایسی حرکت جس سے کسی کے دل میں افسردگی و اضمحلال پیدا ہو — اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا۔ (۵۶/۲۵-۲۶) اس میں ہر طرف سے سلامتی کی نشیدِ دلنواز و آہنگِ جاں افروز سنائی دیتی ہے۔ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ۔ (۷/۴۳)۔ ان کے سینے تمام ایسی کثافتوں سے پاک و صاف ہوں گے جنہیں انسان، غلط معاشرہ میں، دل میں چھپائے رکھتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہوگی جسے ایک دوسرے سے چھپانے کی ضرورت پڑے۔ تکریمِ انسانیت اور احترامِ آدمیت وہاں کا عام اندازِ نگاہ ہوگا۔ وہاں نہ کوئی کسی کو ذلیل سمجھے گا نہ ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس معاشرہ کا اندازہ ہو گا جس کا نقشہ اقبال نے (جاوید نامہ میں) ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ؎

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش!
خوبروئے و نرم خوئے و سادہ پوش!

فکرِ شاں بے درد و سوزِ اکتساب	رازدانِ کیمیائے آفتاب
کس ز دینار و درم آگاہ نیست	ایں بتاں را در حرمہا راہ نیست
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر	کارہا را کس نمی سنجد بزر

سخت کش دہقاں چراغش روشن است | از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کشت وکارش بے نزاعِ آبجو ! | حاصلش بے شرکتِ غیرے ازوست !
اندراں عالم نہ لشکر نے قشون | نے کسے روزی خوروازکشت وخون
نے قلم در مرغدیں گیرد فروغ | ازفنِ تحریر وتشہیرِ دروغ

نے ببازاراں زبے کاراں خروش
نے صدا ہائے گدایاں دردِ گوش

آخر میں اقبال نے اس تمام تفصیل کو ایک شعر میں اس طرح سمٹا دیا ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی قرآنی مملکت وہ ہے کہ ؎

کس دریں جا سائل ومحروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ڮ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ۔ (۲۱/۹۲)۔ اوپر ایک خدا جس کی اطاعت کا قلادہ زیبِ گلو اور نیچے ساری اُمّت ایک صف میں دوش بدوش ایستادہ —— نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (۳/۷۸) اس میں کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا خواہ اُسے ضابطۂ قوانین اور حکومت، حتّٰی کہ نبوت بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں کو اپنا محکوم بنائے اور ظاہر ہے کہ کسی کو محکوم بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اُسے محتاج بنا دیا جائے۔ جب قرآنی مملکت میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوگا تو وہ کسی کا محکوم کس طرح سے ہوگا۔

اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل کی ابتداء خود اربابِ نظم ونسق کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول، قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ :-

> اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دیگر افرادِ معاشرہ بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں عوام کا اچھا رکھوالا نہیں —— خدا کی قسم! اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر جائے تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پُرس ہوگی۔

اور حضور نبی اکرمؐ کا یہ ارشادِ گرامی کہ

> جس بستی میں کسی ایک شخص نے بھی رات بھوکے بسر کی تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کا ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی لئے قرآنی مملکت کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک سے مر جائے تو اس بستی کے باشندوں کو اس کا قاتل سمجھا جاتا ہے اور ان سے اس کا خون بہا وصول کیا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنی مملکت کا یہ نظام اسی صورت میں قائم رہ سکتا اور بہ حُسن و خوبی چل سکتا ہے، جب اس کے عمال (کارندے) دیانتدار اور قابل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ بار بار اس قسم کی تاکیدی ہدایات جاری کرتے رہتے تھے کہ:-

یاد رکھو! جس شخص کے سپرد امت کا کوئی اقتدار ہوا اور پھر اس نے قابلیت کے بجائے اپنی محبت یا قرابت کی بنا پر کسی کو مسلمانوں کا حاکم بنا دیا، تو اس نے اللہ، اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے غداری کی۔

اس باب میں ان کی احتیاط کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ انہیں ولایتِ کوفہ کے لیے ایک خاص ٹائپ کے کارکن کی ضرورت تھی جو بسیار کوشش کے باوجود مل نہیں رہا تھا۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسے آدمی کو جانتا ہوں جو ان خوبیوں کا مالک ہے، آپ اسے منتخب کر لیں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں آپ کا بیٹا ــــ عبداللہ، ــــ یہ سنکر انہوں نے کہا کہ قاتلك الله۔ خدا تجھے غارت کرے تو مجھے یہ کس قسم کا مشورہ دے رہا ہے؟ عبداللہ ابن عمرؓ بے شک ان خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس کا احساس تھا کہ اگر اس کی طرح پڑ گئی تو اس کا انجام کس قدر تباہ کن ہوگا۔ مملکت کے مناصب، اربابِ اقتدار کے اعزہ و اقارب میں بٹنے لگ جائیں گے۔ وہ عمالِ حکومت کو تاکیداً کہتے رہتے تھے کہ

سخت کوشی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنو۔ موٹا جھوٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو، پرانے کپڑے استعمال کرو سواریوں کو خوب چارہ دو، ڈٹ کر گھوڑے کی سواری کرو، اور جم کر تیر اندازی کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں جو ہم دیکھتے ہیں کہ اُس دور میں حکومت کا کوئی کارندہ بددیانت اور رشوت خور نہیں تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کے معاشی نظام میں کسی کو بددیانت بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ بددیانتی اور رشوت خوری کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے مستقبل کے متعلق ہمیشہ دھڑکا رہتا ہے۔ یہ عدم تحفظ (INSECURITY) کا احساس اور خدشہ ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی طرف مائل کر دیتا ہے اس کی ابتدا تو اس سے ہوتی ہے اور اس کے بعد زر اندوزی کی ہوس انہیں آگے ہی آگے لیے چلی جاتی ہے۔ قرآنی مملکت کے نظام میں عدم تحفظ کا خیال تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس میں تمام افراد مملکت اور ان کے بچوں کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے اس لیے کسی کو اس کی فکر ہی نہیں ہوتی کہ کل کو میرا یا میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا اور نہ ہی اس میں جائیدادیں کھڑی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نظام میں کوئی شخص بددیانت ہو نہیں سکتا۔ سے بددیانت ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

محیر العقول کارنامے

اگلے دنوں میرے ایک فوجی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ قرنِ اوّل میں مسلمان سپاہیوں (مجاہدین) نے جو محیر العقول کارنامے کر دکھائے، اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں نے کہا کہ ذرا اس پر غور کیجئے۔ کہ وہ کون سے اسباب و احساسات ہیں جن کی وجہ سے ایک سپاہی میدان جنگ سے بھاگ جاتا ہے یا کمزوری دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور دوسرا احساس یہ کہ میرے بعد میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ تباہ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہ تصور دیا کہ موت صرف نقلِ مکانی کا نام ہے کوئی انسان موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔ وہ زندہ رہتا ہے۔ بس صرف مکان کی تبدیلی ہوتی ہے (اسی لیے ہمارے ہاں موت کے لیے انتقال کا لفظ رائج تھا جو اس تصور کی ٹھیک ترجمانی کرتا تھا) مسلمان سپاہی کے دل میں یہ تصور ایمان کی حیثیت لیے ہوتا ہے اس لیے اُسے موت کا ڈر ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ دھڑکا کہ میرے مرنے کے بعد میری بیوی بچوں کا کیا ہوگا، تو اس کی ذمہ داری پہلے ہی سے مملکت نے لے رکھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے یہ غم بھی نہیں ستاتا۔ اب سوچئے کہ جس سپاہی کو نہ موت کا ڈر ہو اور نہ ہی اپنے پسماندگان کے مستقبل کی طرف سے کسی قسم کا تردد ہو، اس کے زورِ بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کی تو نگاہ سے (اقبالؒ کے الفاظ میں) تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر روٹی کی فکر سے آزاد کر دیا جائے تو وہ جن بن جاتا ہے۔ اس کی وہ صلاحیتیں جو اس سے پہلے، چکی کے اس پاٹ ــــ (MILL-STONE) ــــ کے نیچے بُری طرح سے دبی اور کچلی رہتی ہیں، اس طرح اُبھر کر باہر آتی ہیں کہ وہ کچھ اور کی اور مخلوق بن جاتا ہے۔ وہ صحیح انسانی پیکر میں سامنے آتا ہے۔ اس کی عظمتِ انسانیت چھلک کر باہر آجاتی ہے اس کی ممکناتِ زندگی ایک ایک کر کے محسوس پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ، وہ کچھ کر کے دکھا دیتا ہے جسے عام سطح کا انسان، معجزات اور کرامات سمجھتا ہے حالانکہ وہ نہ کوئی معجزہ ہوتا ہے نہ کرامت۔ روٹی کے چکر میں پھنسا ہوا انسان کبھی انسانی سطح پر آ نہیں سکتا۔ اسے کسی انسانی مسئلہ کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی یہی وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے حضرات انبیاء کرامؑ سے کہا کہ:۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا۔ (۲۳/۵۱)

اے ہمارے رسولو! خوشگوار رزق کھاؤ اور اعمال صالح کرو۔

آپ نے غور فرمایا کہ اعمالِ صالح اور روٹی کا کس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں ایک مذہبی افسانہ مشہور ہے کہ ابلیس نے آدم کو دانۂ گندم کھلا دیا۔ جس سے وہ جنت سے باہر نکال دیا گیا تو اس سے کسی سیانے نے اسی طرف اشارہ تو نہیں کیا کہ انسان کو جنت سے نکلوانا مقصود ہو تو اسے روٹی کی فکر میں الجھا دو۔ اس کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ اس نے قصۂ آدمؑ کے تمثیلی انداز میں بتایا ہے کہ آدمؑ جس جنت میں رہتا تھا۔ وہاں اُسے روٹی کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہاں اس کی کیفیت یہ تھی کہ ــــ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ

شِئْتُمَا۔ (۲/۳۵)۔ وہ جہاں سے جی چاہتا پیٹ بھر کر کھا لیتا۔ اس سے کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم ابلیس کے فریب میں آ گئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ــــ يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى۔ (۲۰/۱۱۷) ــــ تو وہ تمہیں اس جنتی زندگی سے نکلوا دے گا۔ اور تمہیں اسی روٹی کی خاطر جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی۔ انسان اس کے فریب میں آ گیا۔ جس کا نتیجہ سرمایہ دارانہ نظام کی انفرادیت تھی۔ اس سے ــــ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ (۲/۳۶) کی انسانیت سوز جہنم وجود میں آ گئی۔ جس میں ہر فرد کا مفاد دوسرے فرد کے مفاد سے ٹکرانے لگا۔ انسان کو اس جہنم سے نکالنے کے لیے، آسمانی راہنمائی کا سلسلہ شروع ہوا۔

بعثتِ نبی اکرم کا مقصد

قرآن کریم نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ ــــ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷) ــــ یہ ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی۔ اور اس کے سر سے ان سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے نیچے وہ بُری طرح دبی ہوئی تھی۔ ان زنجیروں میں سب سے زیادہ کڑی، اور ان سلوں میں سب سے زیادہ بوجھل، وہ خوف و ہراس تھا جو "روحانی قوتوں" کے نام سے انسان کے اعصاب پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس سے اس میں جس قسم کی نفسیاتی الجھنیں (COMPLEXES) پیدا ہوتی تھیں، ہماری علمی دنیا اب اُن سے اچھی طرح روشناس ہو چکی ہے۔ قرآن کریم نے ختمِ نبوت[1] کے اعلان سے اس سارے بوجھ کو الگ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ اب کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے آ کر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ میں آسمان سے آیا ہوں اور تم زمینی مخلوق ہو۔ خود نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر کہ ــــ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ــــ اس باب میں سبقت کی۔

اب کوئی مافوق الفطرت عنصر، یا جسے عام طور پر روحانی قوت کہا جاتا ہے، انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اس سے انسانی صلاحیتوں کو ابھرنے اور نشو و نما پانے کا کلی امکان حاصل ہو گیا۔ اور انسان کو پرکھنے کا معیار، شرفِ انسانیت (یعنی اس کی انسانی صلاحیتوں کی سطح) قرار پا گیا۔ اس حقیقت کو قرآنی معاشرہ کے اربابِ فکر و عمل کیسے اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کے پیش کردہ اس معیار سے لگائیے جو ہمیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ملتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک بار کوئی شخص آپ کے سامنے کسی مقدمہ میں پیش ہوا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ ایک آدمی کو لایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم اس شخص کو اچھی طرح

---

[1] ختم نبوت کے بعد "آسمانی آواز"، قرآن کے اندر محفوظ ہے جو قیامت تک تمام نوعِ انسانی کے لیے مکمل ضابطہ ہدایت ہے۔ اس کے علاوہ اب کوئی خدائی اتھارٹی نہیں بن سکتا۔

جانتے ہو۔ اس نے ہاں کہا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے واقف ہو۔ اُس نے نفی میں جواب دیا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ملا۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ تو حضرت عمرؓ نے جو کچھ فرمایا وہ اس نکتہ کی اچھی طرح حقیقت کشائی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ

پھر یوں نظر آتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے، کبھی سر جھکاتے، اور سر اوپر اٹھاتے ہی دیکھا ہے۔

اس نے اقرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ "چلے جاؤ۔ تم اسے خاک نہیں جانتے" اور اس شخص سے کہا کہ تم کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو تمہیں انسان کی حیثیت سے جانتا ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی عطا فرمودہ نئی اقدار، اور نبی اکرمؐ کے عدیم المثال عمل نے، انسانیت کے ماپنے کے کس قدر نئے پیمانے عطا کر دیئے تھے۔ یہ وہ پیمانے تھے جن کی رُو سے انسان کی قدر و قیمت اس کی انسانی صلاحیتوں کی بنا پر متعین ہوتی تھی اور ان صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقعہ ان اقدار کی رُو سے ملتا تھا۔

نہ خوف نہ حُزن

وہ دوسری سلیں جنہوں نے انسان کو بُری طرح کچل رکھا تھا، چکی کے پاٹ تھے یعنی روٹی کی فکر۔ قرآنی مملکت نے انسان کو اس فکر سے آزاد کر کے، مجبوسِ قفس طائرِ لاہوتی کو آزادی کی حقیقی فضاؤں میں اذنِ بال کشائی دے دیا جس سے اُسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی۔ قرآنِ کریم نے قرآنی مملکت کی خصوصیت کبریٰ یہ بتائی ہے کہ اس میں افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ ان پر نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حُزن۔ یعنی وہ ہر قسم کے خوف اور حزن سے مامون ہوں گے۔ خوف کے معنی تو ہم سمجھتے ہیں۔ کسی آنے والے خطرہ کے احساس سے ہراساں۔ قرآنی مملکت میں کس قدر بے خوفی اور امن ہوتا ہے، اس کے متعلق نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نظام قائم کروں گا جس کی حالت یہ ہو گی کہ یمن میں ایک عورت تنہا، صحراؤں اور بیابانوں سے سفر کرتی ہوئی شام تک چلی جائے گی۔ اور اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا بے خوفی اور امن کے ماپنے کا اس سے بہتر پیمانہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ باقی رہا وہ خوف جو زبردستوں کی طرف سے ہر وقت وجہ سوہانِ روح بنا رہتا ہے، سو اس کے متعلق وہ واقعہ سامنے لایئے کہ حضرت عمرؓ ایک دفعہ ایک وادی میں سے گزر رہے تھے کہ آپؓ نے یکایک سواری کو روکا۔ نیچے اُترے اور سجدے میں گر گئے۔ رفقاء نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا۔ تو فرمایا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں عمرؓ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا، اور سہمے سہمے پھرا کرتا تھا۔ باپ بھی سخت تھا اور یونہی بات بات پر پیٹ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا اور ایک یہ دن ہے کہ عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں جس سے ڈرا جائے یہ وادی دیکھ کر مجھے یہ احساس اس شدت سے ہوا

کہ میں بے اختیار بحضور ربّ العزت سجدہ میں گر گیا۔

یہ ہوتا ہے، قرآنی مملکت میں بے خوفی کا عالم۔ اس میں خدا، اور بندے کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی جس سے ڈرا جائے اور خدا کا ڈر بھی کسی مستبد حاکم کا ڈر نہیں ہوتا۔ خدا کے ڈر سے مراد ہوتا ہے اس نقصان اور تباہی کا احساس، جو قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً جس طرح ہم دریا کے کنارے چلتے ہوئے پاؤں پھسلنے کے انجام سے ڈرتے ہیں۔ قرآنی مملکت میں قانون شکنی کے نقصان رساں نتائج کے احساس کے علاوہ اور کسی قسم کا خوف کسی کو نہیں ستاتا۔

باقی رہا حُزن، تو یہ لفظ بڑے گہرے معانی کا حامل ہے۔ عام طور پر اس کے معنی افسردگی اور اندوہ ناکی ہوتے ہیں خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن اسے بالخصوص اس افسردگی اور غمگینی کے لیے بولا جاتا ہے جو معاشی پریشانی کی وجہ سے حائل ہو۔ سورۂ فاطر میں جنتی معاشرہ میں بسنے والوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی زبان پر بے ساختہ یہ الفاظ آئیں گے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ط۔ کس قدر قابلِ حمد و ستائش ہے خدا کا وہ نظام، جس نے ہمیں حُزن سے نجات دلائی۔ عربی زبان کے مستند لغت تاج العروس میں لکھا ہے کہ یہاں حزن کے معنی ہیں صبح و شام کے کھانے کی فکر ــــ اس کی تشریح خود اگلی آیت نے کر دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ۔ (۳۵/۳۵) وہ خدا جس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں ایسا معاشرہ عطا کر دیا ہے جس میں نہ کوئی جگر پاش مشقت ہے، نہ ذہنی کاوش و نفسیاتی افسردگی نہ اس میں روٹی کے لیے مارے مارے پھرنا پڑتا ہے اور نہ ہی باہمی معاملات میں اس قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس میں انسان خواہ مخواہ پریشان رہے ــــ فکرِ معاش کی طرف سے آسودگی اور باہمی خوش معاملگی یہ ہیں قرآنی مملکت کی بنیادی برکات و حسنات۔

قرآنِ کریم میں سورۃ فاتحہ کی ابتداء اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا درخورِ حمد و ستائش اس لئے ہے کہ وہ کائنات کی نشوونما کرتا ہے اور قرآن کی آخری سورت میں اسے ربّ الناس کہا گیا ہے۔ یعنی پوری نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے والا ــــ جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے، انسانی دنیا میں خدا کی یہ ذمہ داری اس مملکت کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے نام سے قائم کی جاتی ہے۔ یہ مملکت بھی اسی لیے مستحقِ حمد و ستائش ہوتی ہے کہ یہ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرتی ہے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام کرتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو قطعاً مستحقِ تعریف و توصیف قرار نہیں پا سکتی۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنی مملکت کے اربابِ بست و کشاد ہمیشہ اس فریضہ کی ادائیگی میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں۔ وہ سزاوارِ حمد و ستائش قرار ہی اس وقت پاتے ہیں جب وہ یہ کچھ کر کے دکھائیں۔ ان کے برعکس، دوسرے اربابِ اقتدار

کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا۔ (۳/۱۸۷) ان کی ہر وقت یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی تعریف ان کاموں کی بنا پر کی جائے جنہیں وہ سرانجام نہیں دیتے۔ قرآنی مملکت میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس میں یہ لوگ سب کچھ کر کے بھی کسی صلہ کی توقع یا ستائش کی تمنا نہیں رکھتے۔ اگر کوئی بے ساختہ ان کا سپاس گذار ہونا بھی چاہتا ہے۔ تو وہ اس سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا (۷۶/۹) ہم تم سے کسی معاوضہ کے تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں ہیں۔

ہمارے ہاں، بدقسمتی سے "امام مہدی" کا صحیح مفہوم نظریاتی بحثوں اور معتقداتی پیچیدگیوں میں کھو کر رہ گیا ہے ورنہ اگر وہ روایات صحیح ہیں، تو نبی اکرمؐ نے، ان میں صحیح قرآنی نظام کے سربراہ کی خصوصیات کی طرف اشارہ فرمایا تھا نہ کہ کسی مافوق الفطرت راستے سے آنے والی منفرد شخصیت کی منفرد خصوصیات — آپ نے اس سربراہِ مملکتِ اسلامیہ کی نمایاں خصوصیت یہ بتائی تھی کہ یقسم المال صحیحًا۔ وہ مال کی صحیح صحیح تقسیم کرتا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ مال کی صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ بالسویۃ بین الناس۔ تسویہ کے معنی ہوتے ہیں کسی شے میں ہر وقت کا صحیح صحیح تناسب کے ساتھ موجود ہونا۔ اور اس طرح اس کا اپنی انتہائی نشوونما تک پہنچ جانا۔ اَلسَّوِیُّ اس چیز کو کہا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو اور ٹھیک ٹھیک تناسب رکھتی ہو اِسْتَوَی الرَّجُلُ کے معنی ہیں، اس شخص کا شباب اپنے انتہا تک پہنچ گیا۔ لہٰذا مال کی تقسیم تسویۃً کے معنی یہ ہوں گے کہ معاشرہ میں سرمایہ کی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ اس میں افراط ہو نہ تفریط بلکہ اس انداز سے کہ ہر شخص کی صحیح صحیح نشوونما ہو سکے اور اس کی صلاحیتیں بھرپور شباب تک پہنچ جائیں۔

قرآنی مملکت کی خصوصیات کی تفصیل اتنی طویل ہے کہ اسے ایک نشست میں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میں آخر میں حضرت عمرؓ کے اس قول کو پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک اس باب میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم میں سے جب بھی کسی شخص کو کوئی شکایت ہوتی ہے تو وہ کسی ایسے دروازے کو تلاش کرتا ہے جس پر دستک دینے سے اس کی شکایت رفع ہو سکے۔ اور جب وہ دنیا کے تمام دروازوں کو بند پاتا ہے تو مجبور ہو کر اپنے خدا سے فریاد کرتا ہے۔ اسے دعا کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک خطبۂ عام میں کہا تھا کہ:-

لوگو! مجھے اللہ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچانے سے روک دوں۔

یعنی ایسا انتظام کر دوں کہ اوّل تو تمہیں کسی بات کے لیے خدا کے ہاں فریاد کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو قبل اس کے کہ تمہاری شکایت خدا تک پہنچے، اس کا ازالہ ہو چکا ہو — یہ ہے قرآنی مملکت کی بنیادی خصوصیت اور یہی وہ امامتِ کبریٰ ہے جس کے حصول کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ امامت اس لیے کہ اس قسم کی مملکت کا وجود دنیا میں کہیں نہیں تھا۔ اس لیے پاکستان کی تشکیل سے یہ سبقت و امامت اسی کے حصہ میں آنی

تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصوّر دینے والے (اقبالؔ) نے، یہ تصوّر دیتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قرآنی پاکستان، اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصوّر کا حسین و جمیل پیکر ہوتا ——

لیکن

اور یہ "لیکن" ایک داستان ہے جگر گداز اور ایک حدیث ہے دلخراش —— اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ ؎

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لئے میں اس خواب رُبا قصہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے، اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۵ سامنے لایئے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِيٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا ... ...

تم انہیں اس شخص کی عبرت آمیز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے تمام نشاناتِ راہ عطا کر دیئے تھے لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہو گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اُس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا اور یوں راہ سے بے راہ رَو ہو گیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہولناکیوں سے اس کی مثال کُتّے کی سی ہو گئی کہ اُسے اُکساؤ اور دوڑاؤ تو بھی وہ ہانپے اور زبان نکالے اور ویسے چھوڑ دو، تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین (کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں) جھٹلاتی ہے۔ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ۔ شاید یہ اس پر غور و فکر کریں۔ اور سوچیں کہ ہمیں کیا ہو گیا۔

سَاۗءَ مَثَلَ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا. اُف اِکس قدر بُری حالت ہو جاتی ہے اُس قوم کی جو ہمارے قوانین کی عملاً تکذیب کرتی ہے۔ اس میں ہر ظلم وزیادتی کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کو لوٹ کر اپنا فائدہ کر رہا ہوں۔ لیکن نہیں سوچتا کہ وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ۔ وہ اسطرح کسی دوسرے کا نہیں، خود اپنا ہی نقصان کر رہا ہے۔ جذبات پرستی کے طوفان میں غرق ہونے سے ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن اُن سے سمجھنے اور سوچنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا. وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ ان کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ۔ تم انہیں انسان سمجھتے ہو؟ نہیں!— یہ انسان نہیں حیوان نہیں — بَلْ هُمْ اَضَلُّ — نہیں! یہ تو ان سے بھی گئے گذرے ہیں۔ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ (۷/۱۷۹) حیوان اپنی زندگی کے تقاضوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا اور ان انسان نما حیوانوں کو خبر ہی نہیں کہ ان کی زندگی کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کس طرف جا رہے ہیں۔ ؎

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

پرویز

تعزیت

احبابِ کراچی نے اطلاع دی ہے کہ ان کے ایک دیرینہ رفیق محترم طاہر ابرار انصاری صاحب جو کراچی کے علاوہ دیگر کئی بزموں کے بھی رکن رہ چکے ہیں کراچی میں مؤرخہ ۸/۱۰/۸۷ کو وفات پا گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرماویں اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل!

ناظم ادارہ

تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تصور دینے والے (اقبال) نے، یہ تصور دیتے ہوئے کہا تھا کہ:-

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

قرآنی پاکستان، اسی عالم افروز اور انسانیت ساز تصور کا حسین و جمیل پیکر ہوتا ——

لیکن

اور یہ "لیکن" ایک داستان ہے جگر گداز اور ایک حدیث ہے دلخراش —— اگر میں نے اسے بیان کرنا شروع کر دیا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ ؎

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

اس لیے میں اس خواب رُبا قصہ کی تفصیل میں جانے کے بجائے، اسے قرآن کے الفاظ میں کیوں نہ پیش کر دوں جن میں اختصار اور جامعیت معجزانہ حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ آپ سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۵ سامنے لایئے جہاں سے بات کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا ... ...

تم انہیں اس شخص کی عبرت آمیز داستان (تمثیلاً) سناؤ جسے ہم نے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے تمام نشاناتِ راہ عطا کر دیئے تھے لیکن وہ انہیں چھوڑ کر یوں الگ ہو گیا جیسے سانپ اپنی کینچلی سے نکل جاتا ہے کہ اس پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور پست جذبات کی تسکین کے پیچھے لگ گیا اور یوں راہ سے بے راہ رَو ہو گیا۔

ہم چاہتے تھے کہ وہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے لیکن وہ زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ انفرادی مفاد پرستیوں کا نتیجہ یہی ہوا کرتا ہے۔ ان ہولناکیوں سے اس کی مثال کُتّے کی سی ہو گئی کہ اُسے اُکساؤ اور دوڑاؤ تو بھی وہ ہانپے اور زبان نکالے اور ویسے چھوڑ دو، تو بھی ہانپے اور زبان لٹکائے۔ اس کا ہونکنا کسی صورت میں کم ہی نہ ہو۔

ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین (کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن عملاً انہیں) جھٹلاتی ہے۔ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ تم انہیں ان کی یہ داستان سناؤ۔ شاید یہ اس پر غور و فکر کریں۔ اور سوچیں کہ ہمیں کیا ہو گیا۔

کچھ ہم اپنے ہی مفادات عاجلہ کی خاطر کرتے چلے جا رہے ہیں، جو کچھ اندھا دھند ہم سے سرزد ہوتا چلا جا رہا ہے، وہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے سامنے کوئی دیوار حائل نہیں۔ اگر کہیں 'حسنِ اتفاق' سے کسی یوقت یونہی چلتے چلتے اپنی کسی غلطی کا خیال آ بھی جاتا ہے تو بس خیال آنے تک ہی محدود رہتا ہے اور محض خیال کرنے سے ہی ہم خود کو نیکوں میں شمار کرنے لگتے ہیں۔ یہ سوچتے، یہ کہتے ہوئے کہ ہم غلطی کو غلطی سمجھتے تو ہیں۔ دیکھتے نہیں تم کہ معاشرہ بھرا پڑا ہے ایسے لوگوں سے جو برائی کو برائی اور غلطی کو غلطی تسلیم ہی نہیں کرتے۔ مگر ہم یہ کہتے ہوئے یہ بھی تو سوچ لیتے کہ جسے اپنی غلطی کا احساس ہی نہیں جو برائی کو برائی مانتا ہی نہیں وہ تو اپنی اصلاح کر سکتا ہے نہ کبھی کرے گا۔ لیکن ہم تو ویسے نہیں۔ ہم غلط اور صحیح میں اچھی خاصی تمیز کرنا جانتے ہیں اور اس مہلت کے وقفے میں جو اللہ کی رحمت سے بظاہر طویل ہی ہوتا چلا جا رہا ہے اپنی اچھی خاصی اصلاح بھی تو کر سکتے ہیں۔ اس دوران غلط راستہ چھوڑ کر سیدھی سمت اگر ہم رُخ نہ کریں گے اور اس پر قدم نہ اٹھائیں گے تو کیا ہم بخشے جائیں گے؟ کیا ہم پر دُہری ذمہ داری عائد نہیں ہوتی؟ اور اس ذمہ داری سے کوتاہی پر کیا ہماری دوہری پکڑ نہ ہوگی؟

دراصل اگر اس صداقت کا ہمیں واقعی یقین ہوتا اور مواخذہ کا احساس ہمارے قلب میں جاگزیں ہوتا تو ہمارے اعمال کی میزان 'سیئات' سے یوں جھکی نہ ہوتی اور ہماری 'حسنات' کا پلڑا ایسا ہلکا نہ ہوتا جو آج نظر آ رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جواب دہی کا احساس انسان کی اُس غلط نگہی اور خود فریبی کو مٹا دینے کی قوت رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ ارتکاب جرم کرتا ہے۔ لیکن جب یہ سمجھ لیا جائے کہ اپنے ہاں تو ہر چھوٹا بڑا بد دیانتی، بے ایمانی اور فریب کاری پر اترا ہوا ہے، کوئی کسی کو پوچھتا نہیں، تو ہمیں کون دیکھے گا۔ یوں بزعم خویش پکڑ کی بات ختم ہو جاتی ہے۔ ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ یوں ہوتا ہے کہ یہ روش زندگی یہ بے راہ روی نہ صرف قائم رہتی ہے بلکہ دائم ہو جاتی ہے۔ ہم تو اپنی بداعمالیوں کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن خدا کا قانونِ مکافات سب کچھ محفوظ رکھتا ہے۔ سب کچھ اس کے سامنے رہتا ہے (۵۸/۶) ہمیں یہ جاننے کی بھی پروا نہیں کہ اللہ کے فرمان کے مطابق قانونِ مکافات سے وابستہ مہلت کے اس وقفے میں ہمارے اعمال کے نتائج ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ پل پل گزرتی وقفے کی ان ساعتوں میں اگر ہم اپنے اعمال کی اصلاح کے لیے مستعد ہو جائیں تو یہ پیچھا اللہ کی رحمت اور اس کے فضل و کرم میں بدل جائے اور مہلت کا یہ وقفہ ختم ہونے پر ہم تباہی سے بچ جائیں۔ اور ہمیں مغفرت مل جائے۔ مگر یاد رہے کہ مغفرت اس 'بخشش' کا خود ساختہ تصور نہیں جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ جسے ہم نے اپنے ذہنوں میں قائم کر رکھا ہے۔ یہ بخشش کا مفروضہ ہی تو ہے جس سے ہمارے نزدیک مہلت کا وقفہ بے حقیقت ہو چکا ہے۔ ہم اپنی اصلاح کیوں کریں۔ ہمارے گناہ بخشے ہی جانے ہیں پھر خواہ مخواہ کے تردد میں پڑنے کا فائدہ! گناہ کون نہیں کرتا؟ آخر بندہ بشر ہے گناہ تو کرے گا اس میں فکر کی کیا بات ہے۔" اپنے اللہ" سے معافی ہی تو مانگنی ہے۔ اس کے حضور گڑگڑا کر چند الفاظ ہی تو ادا کرنے ہیں۔ اللہ بڑا بخشن ہار ہے۔ یہ تو ہوئی 'بخشش' اس

کا مغفرت قرآنی سے کیا تعلق۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ حسن عمل سے انسانوں کے اندر وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ تخریبی قوتوں کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ ہوتی ہے مغفرت۔ یہ ایسے کام کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے، جن سے انسانی یعنی ہماری صلاحیتوں میں نشوونما پیدا ہو جائے۔

مہلت کا وقفہ میسر رہنے کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وقت ابھی ہمارے ہاتھوں سے نکل نہیں گیا۔ ابھی وقت باقی ہے۔ ابھی ہم اس سے بقدر استطاعت بہ لحاظ جد وجہد فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ تعمیری کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ یہی اہم ترین نکتہ سب سے اول ہمارے سمجھنے کا ہے محسوس کرنے کا ہے۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا احساس ہی بلندیٔ اخلاق۔ پاکیزگی، سیرت اور ذمہ داری سے احساس کا جذبہ محرک بنتا ہے۔ احساس ارادے کو جنم دیتا ہے اور ارادے سے عمل وجود میں آتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں کون نہیں جانتا انہیں کیوں دہرایا جا رہا ہے؟ درست فرمایا آپ نے! یہ باتیں بہت چھوٹی ہیں تبھی تو ہمیں نظر نہیں آتیں اور ہمیں ان کی طرف دھیان نہیں دینا چاہتے۔ لیکن آپ ہی بتائیے کبھی کوئی عمارت بنیاد کے بغیر کھڑی ہوئی ہے یا ہو سکتی ہے!

بہرحال ہماری کیفیت یہ ہے کہ ایک طرف خود تو عمل سے فارغ رہ کر خوش گوار نتائج سے اپنا دامن بھر لینا بلکہ بھرتے رہنا ہمارا مقصودِ حیات بن چکا ہے، دوسری طرف ہمیں یہ شکایت بھی ہے کہ اعمالِ بد کرنے والوں پر اللہ عذاب نازل کرتا تو ہے نہیں آخر یہ تاخیر کیوں؟ اس لیے کہ اللہ کے ہاں فوری گرفت نہیں ہوا کرتی اگر ایسا ہوتا اور اس نے قانونِ مکافاتِ عمل کے اندر مہلت کا وقفہ نہ رکھا ہوتا تو آج صفحۂ ارض پر کوئی چلنے والا انسان نظر نہ آتا۔ یہ مہلت کا وقفہ ہمارے لئے پوری انسانیت کے لیے ایک بیش بہا نعمت ہے بشرطیکہ ہم اس کی قدر قیمت پہچانیں، جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ اپنے اعمال کی تطہیر سے اپنا مجموعی کردار تعمیر کر لیں۔ اس اٹل حقیقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ مہلت کی رعایت ختم ہونے پر فیصلہ کن نتائج کے سامنے آنے میں قانونِ خداوندی کے مطابق ایک ثانیہ کی بھی دیر نہ ہوگی۔ سورۃ النحل کی ۶۱ ویں آیت اس پر شاہد ہے وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ اس کے باوجود جب افرادِ معاشرہ کا عمومی چلن یہ ہو کہ ذاتی مفادات کی خاطر بلا تامل ہر قسم کی ہیرا پھیری، قانون شکنی اور قواعد وضوابط سے لاتعلقی ہوتی رہے اور فکر ہو تو صرف یہ کہ بس ہماری ان باتوں کی اس طرح خبر نہ ہونے پائے کہ ہم پر کوئی ہاتھ اٹھا سکے۔ ہم کوئی ایسا انتظام کریں کہ ہمارے کئے کی گرفت نہ ہو سکے تو پھر ستے ای خیراں نیں، پھر گویا ہم ہر خوف خطر سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یہ باطل نظریہ اور گمراہ سوچ اس وجہ سے ہے کہ جب ہمیں اپنی جسمانی زندگی یہاں ختم ہوتی نظر آتی ہے تو ہم یہ بھی تصور کر لیتے ہیں کہ ہمارے سب اچھے بُرے اعمال بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گے۔ یعنی نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ مگر ذرا اِس کتاب مبین کی آیات پر غور کیا ہوتا جس پر ہمارا ایمان ہے کہ یہ اللہ

کا کلام ہے جو ہم سب انسانوں کے لیے ضابطۂ حیات بنا کر اتارا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ کیا تم [illegible] کہ ہم نے تمہیں بلا مقصد پیدا کر دیا ہے اور تم ہماری طرف آؤ گے نہیں؟" بامقصد پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسانی زندگی کا ایک مستقبل ہے وہ یہاں ختم نہیں ہوتی ہمارے اعمال کو لے کر آگے چلتی ہے اور حیاتِ آخرت کا نام [illegible] ہے۔ جہاں ہر فرد کے مقام کا تعین اس کے اعمال کے مطابق ہوگا سورۃ النمل میں کہا گیا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ یَعْمَهُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝ (۲۷/۴-۵) بے شک جو لوگ آخرت کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے اور زندگی کو صرف اسی دنیا تک محدود اور اسی کے مفاد کا حصول مقصدِ حیات [illegible] ہیں انہیں اپنے اعمال بڑے خوشنما دکھائی دیتے ہیں اور وہ اس خود فریبی میں بھٹکتے رہتے ہیں [illegible] ان کی غلط روشِ زندگی ان کے لیے بڑی تباہی کا موجب ہوتی ہے اور یہ بھی کہ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ۝ آخرت کا عذاب زیادہ شدید اور باقی رہنے والا ہوتا ہے۔ کیا یہ ہمارے لیے نہیں کہا جا رہا؟ شاید یہ بھی ہماری شامتِ اعمال ہے کہ ہمارا خیال اس طرف منتقل ہی نہیں ہوتا کہ دم بھر رک کر اپنے قول و فعل کا [illegible] لیں۔ قول و فعل کے درمیان جو تضاد روا رکھا ہوا ہے اسے سمجھیں تاکہ زندگی کی اس مہلت میں اس کا قلع قمع ہو [illegible]۔ اس سنگین تضاد کی موجودگی میں ہمارا دعویٰ یقینِ آخرت کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اور یقینِ آخرت کے بغیر مہلت کا [illegible] ہمیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ پھر کب ہم اصلاحِ احوال کریں گے اگر سکیں گے؟ کبھی ہم نے سوچا کہ اس مہلت کے سوا اور کون سا وقت حسنات اختیار کرنے کے لیے ہمیں میسر آئے گا۔ آیئے سوچیں۔

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا سالانہ چندہ

(۱)۔ اندرونِ ملک پاکستان -/۴۸ روپے
غیر ممالک بذریعہ بحری ڈاک -/۱۱۰ روپے

۲۔ غیر ممالک بذریعہ ہوائی ڈاک

(i)۔ ایران، عراق، مصر اور بنگلہ دیش -/۱۴۰ روپے
(ii)۔ عرب امارات، لبنان، یمن، کویت، سعودی عرب، سری لنکا، جزائر مالدیپ وغیرہ -/۱۵۰ روپے
(iii)۔ انڈیا، برما، لیبیا، کینیا، یوگنڈا، جنوبی افریقہ وغیرہ -/۱۶۰ روپے
(iv)۔ یورپ کے ممالک (برطانیہ، فرانس، ناروے وغیرہ) -/۱۶۰ روپے
(v)۔ جنوب مشرقی ایشیائی ممالک (فلپائن، سنگاپور، ملائشیا، جاپان وغیرہ) -/۱۶۰ روپے
(vi)۔ امریکہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا، جزائر فجی وغیرہ -/۲۰۰ روپے

(۳) مذکورہ بالا چندہ میں خرچ ڈاک شامل ہے۔ البتہ جو خریدار پرچہ بذریعہ رجسٹری منگوانا چاہیں ان کی طرف فیس رجسٹری -/۳ روپے فی پرچہ علیحدہ ادا کرنا ہوگا۔ والسلام۔ ناظم ادارہ

نوٹ: ماہنامہ طلوعِ اسلام کے لیے صرف ادارہ طلوعِ اسلام کو لکھیے۔

حقائق و عبر

۱۔ شریعت بل کا المیہ

شریعت بل، جس کے حوالے سے مفاد پرست علماء کا ایک طبقہ کہ جس میں جماعت اسلامی پیش پیش تھی، دو سال تک اسلام کے نام پر عوام کے جذبات سے کھیلتا رہا، اس بل کا جو انجام ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں ان علماء کا جو کردار سامنے آیا ہے، اس کے بارے میں ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، خود متحدہ شریعت محاذ کے ایک سرگرم رکن نے اسے شریعت اسلامی کا ایک المیہ قرار دیا ہے۔ اور اس عنوان کے تحت انہوں نے اپنے ماہنامے میں اس بل کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے بعض حقائق سے پردہ اٹھایا ہے جس سے شریعت بل کے علمبرداروں کے ڈھول کا پول کھل جاتا ہے۔ اس کی تفصیلات خود انہی کی زبانی سنیئے:۔

"یا تو ۲۷ رمضان المبارک کا حتمی الٹی میٹم تھا۔
جہاد و قتال کی باتیں تھیں اور جانیں دے دینے کا عزم مصمم اور شہادت کی موت کی آرزوئیں اور دعائیں تھیں۔
اسمبلیوں اور دوسرے سرکاری اداروں سے استعفوں کی دھمکیاں تھیں۔
اسمبلی اور سکریٹریٹ کے گھیراؤ کے عزائم تھے۔
سرکاری واجبات کی ادائیگی بند کرنے کی دھمکی تھی، اور بین الاقوامی سطح پر علماء کرام اور مفتیانِ عظام سے جہاد کے فتوے حاصل کرنے کی باتیں تھیں۔
یا رمضان المبارک کی آمد سے قبل ہی حکومت کو سبز جھنڈی دکھا دی گئی کہ ہمارا اسمبلیوں وغیرہ سے۔ مستعفی ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے! گویا جو کچھ اب تک کیا یا آئندہ کریں گے وہ محض

ع "لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانا!"

ع "یہ ہیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا!"

اب یہ تو اللہ ہی کو معلوم ہے کہ پس پردہ ہوا کیا ہے؟ اور ع "کون معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں؟"..... لیکن نتیجہ بہرحال یہ نکلا ہے کہ ایک طرف حکومت پختہ ہو گئی اور اس کے بعض کارپردازوں

نے محاذ پر پھبتیاں چست کرنی بھی شروع کر دیں اور کہا تو وہ حال تھا کہ وزراء محاذ کے قائدین کے گرد منڈلاتے رہتے تھے، کہا یہ کہ ع "کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی؟" اور دوسری طرف عوامی جذبہ سرد پڑ گیا ہے، کارکنوں کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ اور وہ اقبال کے اس شعر کے مصداقِ کامل بن گئے ہیں کہ ؎

آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

محاذ کے قائدین و زعما اور اس میں شامل رفقاء و احباب بُرا نہ مانیں تو یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں ہم سب سورۂ اعراف کے ان الفاظ مبارکہ میں وارد مثال پر صد فیصد پورے اترتے ہیں کہ

"جسے ہم نے اپنی نشانیاں عطا فرمائی تھیں..... اور اگر ہم چاہتے ہیں تو ان نشانیوں کی بدولت اُسے مقام رفیع عطا فرما دیتے، لیکن وہ (بدبخت اور کم ہمت) تو زمین ہی کا ہو رہا!"

قصہ مختصر یہ کہ اس وقت شریعت بل اور متحدہ شریعت محاذ دونوں ع "میں ہوں اپنی شکست کی آواز!" کی مجسم تصویر ہیں اور شریعت بل بزبانِ حال اپنے مجوزوں اور مؤیدوں کے لیے نوحہ خواں ہے کہ ؎

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد!

اور بل کے سیکولر مزاج مخالفین اور علماء کرام سے بیزاری رکھنے والے لوگوں کو اقبال کے ان الفاظ میں پھبتی چست کرنے کا موقع مل گیا ہے کہ ؎

اُس معرکے کا انجام معلوم
جس معرکے کا ملّا ہو غازی!

(ماہنامہ میثاق بابت اکتوبر ۱۹۸۷ء صفحات ۲۶، ۲۷، ۲۸)

۲- مودودی صاحب کا اخلاق

مودودی صاحب کے ایک پرانے ساتھی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، جو کئی سالوں تک ان کے بہت قریب رہے ہیں، ان کے اخلاق کے بارے میں ایک انکشاف فرماتے ہیں:-

"اس معاملے میں مودودی صاحب جتنے پختہ واقع ہوئے ہیں اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔

. . . . کہ انہوں نے (۱) نہ تو کبھی نیاز فتح پوری سے حاصل کردہ انشاء پردازی سے بنیادی تربیت کا ذکر فرمایا، (۲) نہ ابوالکلام مرحوم اور خیری برادران سے اخذ کردہ تصورِ حکومت الٰہیہ پر ان حضرات کا کبھی ذکرِ خیر کیا، (۳) اور نہ ہی علامہ اقبالؒ کا یہ احسان کبھی علانیہ تسلیم کیا کہ انہوں نے انہیں حیدرآباد دکن ایسی سنگلاخ جگہ سے جہاں بقول خود ان کے کوئی ان سے یہ بھی نہ پوچھتا تھا کہ "تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں"، پنجاب کی اس سرزمین میں پہنچایا جو ہر تحریک، اور نئی دعوت حتیٰ کہ دعوی نبوت تک کیلئے نہایت زرخیز و سازگار ہے ..... حتیٰ کہ جب علامہ اقبال کا انتقال ہوا اور ملک بھر میں صفِ ماتم بچھ گئی، تب بھی مدیر ترجمان القرآن نے کوئی کلمۂ خیر ..... یا کلمۂ تعزیت اپنے مؤقر جریدے میں شائع نہ فرمایا۔

اور پروفیسر یوسف سلیم چشتی راوی ہیں کہ جب خود انہوں نے اس معاملے میں مودودی صاحب سے استفسار کیا تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا "میں اس وقت حالت جہاد میں ہوں اور میدان قتال میں مردے دفن کرنے کی فرصت کب ہوتی ہے"۔ چشتی صاحب فرماتے ہیں کہ بعد میں جب میں نے یہ دیکھا کہ مودودی صاحب کے حلقے کے جرائد نے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور چودھری علی احمد مرحوم کی وفات پر خاص نمبر تک نکالے اور کتابیں شائع کیں تو میں حیران رہ گیا ؎

"کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!"

(ماہنامہ حکمتِ قرآن بابت ستمبر ۸۷ صـ ۲۷)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اس انکشاف سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خود مودودی صاحب کے پلّے کچھ بھی نہیں تھا، اور شاید اس وجہ سے وہ زیادہ دیر تک ان کے ساتھ نہ رہ سکے۔

۳۔ پاکستان میں علماء کا کردار

"پاکستان میں علماء کا کردار"۔ اس موضوع پر کراچی کے ایک ماہنامے میں مندرجہ ذیل تجزیہ شائع ہوا ہے۔

طبقۂ اوّل

- مسجد اور مدرسہ کی چار دیواری کے اندر درس و تدریس اور خطابت کے فرائض سرانجام دینا۔
- عام طور پر محض درسی کتابوں کے مطالعہ میں انہماک۔
- مذہبی فرائض تک عوام سے میل جول رکھنا۔
- اپنی ذاتی اصلاح اور تزکیۂ نفس کی طرف توجہ۔

- یہ علماء عام طور پر درسی علماء یا بزرگ علماء شمار کئے جاتے ہیں۔

طبقۂ دوم

- مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں سے کسی فرقہ کی نمائندگی کرنا۔
- عوامی اسٹیج پر اپنے فرقہ وارانہ مسائل پر خطاب کرنا۔
- دوسرے فرقوں کی دل آزاری کرنا اور ان کو اسلام سے خارج کرنا۔
- دین کو کاروبار کے طور پر استعمال کرنا۔
- عوام کی پسند کے مطابق اپنے خیالات کو تبدیل کرتے رہنا۔
- ایسے علماء کو خطیب، واعظ، فرقہ پرست یا عوامی عالم کا نام دیا جاتا ہے۔

طبقۂ سوم

- مغربی جمہوریت کے تحت مذہبی سیاسی پارٹی بنا کر اس میں عہدیدار بننا۔
- لادین پارٹیوں سے مصالحت، رواداری اور ہر وقت ان سے میل جول رکھنا۔
- مروجہ دنیوی سیاسی پارٹیوں کی طرح سیاسی ہلڑبازی میں مکمل شرکت۔
- اقتدار کے حصول کے لیے اسلام کا بیجا اور بے دریغ استعمال۔ ان علماء کو مذہبی رہنما، ممتاز عالم دین اور ملت کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔

یہ سب کے سب علماء کرام اپنے اپنے دائرہ کار میں مختلف خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مگر، العلماء ورثۃ الانبیاء کے مصداق جو فریضہ علماء دین کو تفویض کیا گیا ہے اور بہت بڑا اعزاز ان کو عطا کیا گیا ہے، اس پر مجموعی طور پر پورا نہیں اترتے۔

(ماہنامہ مسلم کراچی بابت ماہ ذوالحج ۱۴۰۷ھ ص ۳)

اگر طلوع اسلام ایسا ہی کچھ کہے تو گردن زدنی ٹھہرے!

۴۔ حرام، حلال، پھر حرام پھر حلال

جماعت اسلامی نے جس طرح اسلامی تعلیمات کو مذاق بنا چھوڑا ہے۔ اس کا اندازہ "عورت کے سربراہ مملکت بننے کے بارے میں، ان کے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے نقطۂ نظر سے ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی کے لٹریچر میں عورت کے سربراہ مملکت بننے کو حرام قرار دیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں ان کی سیاسی مصلحتوں نے انہیں

(باقی ص ۴۷ پر)

دین کا نظام کس طرح قائم ہوتا ہے؟

اس طرح کہ:

(۱) ایک آزاد مملکت اس امر کا اعلان کرے کہ اس کا تمام کاروبار، قرآنِ کریم کے مطابق ہوگا۔

(۲) قرآنِ کریم میں کچھ احکام و قوانین، متعیّن شکل میں دیئے گئے ہیں اور بعض اقدار، اصول کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کے احکام و قوانین ہوں یا اصول و اقدار سب غیر متبدّل ہیں اور تمام مسلمانوں پر ہمیشہ کے لیے نافذ العمل رہنے کے لیے دی گئی ہیں۔

(۳) جن اقدار کے صرف اصول دیئے گئے ہیں، مملکت کے اربابِ فکر و نظر ——— نمائندگانِ ملّت۔ ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، ان کے جزئی قوانین مرتب کریں گے۔ ایسا کرنے میں وہ احادیث، تاریخ، فقہ کو اپنے سامنے رکھیں گے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق قوانین مرتب کریں گے جو کچھ پیچھے سے چلا آرہا ہے۔ اس میں جو قوانین ایسے ہوں گے جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہیں، اور جو ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں انہیں ویسے ہی رہنے دیا جائے گا جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوگی، ان میں تبدیلی کر لی جائے گی۔ جہاں نئے قانون کی ضرورت ہو، نیا قانون بنا لیا جائے گا۔ اس طرح قرآن کے اصول غیر متبدّل رہیں گے اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ بدلتے جائیں گے۔ یوں مستقل اور قابلِ تغیّر و تبدّل عناصر کے حسین امتزاج سے، کاروانِ ملّت آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

(۴) دین کا مقصد، انسان کے، اس دنیا کے معاملات کو اس طرح حل کرنا ہے کہ اس سے وہ فساد (ناہمواری) ختم ہو جائے جس کی وجہ سے افراد اور اقوام اس بُری طرح جہنّم کے عذاب میں گرفتار ہیں اور اس کے ساتھ ہی افراد کی ذات کی نشو و نما اس طرح ہوتی جائے کہ وہ موت کے بعد بھی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائے۔ **اگر ہمارا نظام اس قسم کے نتائج پیدا کرتا ہے تو وہ صحیح اسلامی ہے۔** اگر اس سے یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں کہیں خرابی ہے۔ اس خرابی (یا خرابیوں)

کا سراغ ہمیں قرآنِ کریم کی روشنی میں مل سکتا ہے۔ میری حقیر کوششوں سے مقصود یہ ہے کہ ہم ان خرابیوں کا ازالہ کر کے، دین کے نظام کو انہی خطوط پر متشکل کر سکیں جن پر یہ حضور رسالتمآبؐ کے عہدِ مبارک میں استوار ہوا تھا۔

اس کے ساتھ اتنا اور سمجھ لینا چاہیئے کہ جب تک وہ نظام قائم نہ ہو (جسے خلافت علی منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے) اُس وقت تک اُمت جس جس طریق سے اسلام کے ارکان کو ادا کرتی چلی آرہی ہے، اس میں نہ کوئی تبدیلی کی جائے اور نہ ہی کوئی نیا طریقہ وضع کیا جائے۔ اس سے خواہ مخواہ مزید اختلاف اور انتشار پیدا ہوگا۔ البتہ جو نظریات و تصورات یا رسوم اور رواج قرآن کے خلاف رائج ہیں۔ ان کی بابت یہ بتایا جائے کہ یہ قرآن کے خلاف ہیں اور قرآنی نظام کی صحیح شکل کو اُجاگر کر کے اُمت کو اس طرف آنے کی دعوت دی جائے۔ جب وہ نظام قائم ہو جائے گا تو یہ اس کا فریضہ ہوگا کہ دیکھے اور فیصلہ کرے کہ مسلمانوں کے موجودہ اختلافات کو مٹا کر ان میں پھر سے وہ وحدتِ فکر و عمل کیسے پیدا کی جائے جو عہدِ رسالتمآبؐ میں وجہ بالید گیٔ ملت تھی۔ میری کوشش بس اتنی ہے۔ پرویزؒ

(ماخوذ از اسبابِ زوالِ اُمت ایڈیشن ششم صفحہ ۱۵۶ تا ۱۵۸ء)

بقیہ: حقائق و عبر، صـ۴۵ سے آگے

محترمہ فاطمہ جناح کی تائید پر مجبور کیا تو انہوں نے عورت کے سربراہ مملکت بننے کو اسلامی تعلیمات کے عین مطابق قرار دے دیا۔ بعد میں نئی مصلحتوں کی وجہ سے انہوں نے اسے دوبارہ حرام قرار دے دیا آج جماعت اسلامی پیپلز پارٹی سے تعاون کی خواہش مند ہے۔ چنانچہ ان کی توجہ حاصل کرنے کے لیے، پھر عورت کے سربراہ مملکت بننے کے جواز کا اعلان کر دیا ہے ان کے اپنے الفاظ میں:۔

"جماعت اسلامی کے مرکزی نائب امیر پروفیسر غفور احمد نے کہا ہے کہ اسلام عورت کو حکومت کرنے سے نہیں روکتا اور وہ سربراہ مملکت بن سکتی ہے یہ "بات" انہوں نے کراچی کے ایک جریدے کو انٹرویو دیتے ہوئے کی ہے پروفیسر غفور احمد جماعت اسلامی کے ایک مقتدر رہنما ہی نہیں، سیاسی حلقوں میں انہیں "ترقی پسند مولانا" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے"

(ہفت روزہ چٹان لاہور بابت ستمبر ۱۹۸۷ صـ۴)

روزمرہ زندگی سے متعلق

قرآنی احکامات وہدایات

بزبانِ انگریزی

ISLAMIC WAY OF LIVING

از جناب ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب

یہ کتاب آسان انگریزی زبان میں اندرون و بیرون ملک اُن گھرانوں کے بچوں کے لیے خصوصی طور پر لکھی گئی ہے جو صرف انگریزی سے ہی استفادہ کرسکتے ہیں!

اور اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں

بُنیادی نصاب کے طور پر پڑھائی جاسکتی ہے!

سفید کاغذ، صفحات ۱۱۸، خوبصورت گردپوش

قیمت : ۲۰/- روپے (علاوہ محصول ڈاک)

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵-بی گلبرگ، لاہور (پاکستان)

محمد اسلام کراچی

افکارِ پرویزؒ کی صدی

مسلسل از طلوعِ اسلام بابت اگست ۱۹۸۶ء

یہ ہے مقام امیر جماعتِ اسلامی کا! سبحان اللہ ما اعظم شانہٗ۔ یہ ہیں چند مثالیں ان لوگوں کی دیانت کی جن کا دعویٰ یہ ہے کہ انکی زندگی اسلام کی معیاری زندگی ہے۔ پیدائشی مسلمانوں کو ان کے ہاتھ پر تجدیدِ ایمان کرنی چاہیئے۔ اگر صرف پاکستان کی تائید اور مخالفت کے معیار پر دیکھا جائے تو ان لوگوں سے زیادہ اپنے قول کے پکے تو وہ نیشنلسٹ مسلمان ہیں جو پاکستان کی مخالفت کرتے ہیں اور آج بھی ہندوستان ہی میں ہندی قوم کے افراد کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی پاکستان کے مسلمانوں کو وہ فریب نہیں دے سکتے جو جماعتِ اسلامی کے یہ نقاب پوش ناصحینِ مشفق دے رہے ہیں۔ اسی لئے قرآن مفاد پرستوں کو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں جگہ دیتا ہے۔

یہاں تک ہم نے یہ بتایا ہے کہ جماعتِ اسلامی اپنے مقاصد کے حصول کے لئے کس حد تک دیانت کے ساتھ ساتھ ہے۔ اب دوسری چیز یہ دیکھنے کی ہے کہ وہ جس اسلامی نظام کے قیام کی مدعی ہے وہ نظام ہے کیا؟ طلوعِ اسلام کے ہر صفحات میں یہ حقیقت متعدد بار دہرائی جا چکی ہے کہ ہمارا موجودہ مذہب جو ظنیات کے آسرے پر قائم ہے۔ ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح شخصی اجارہ داریوں کو قائم رکھا جائے۔ ہم یہ بھی بتا چکے کہ شخصی اجارہ داریاں قائم نہیں رہ سکتیں تا وقتیکہ انہیں اربابِ مذہب کی تائید حاصل نہ ہو۔ جس طرح روما کے شہر کے لئے پوپ کی ضرورت تھی اور ہندوستانی راجاؤں کے لئے برہمنوں کی، اسی طرح مسلمان بادشاہوں، نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کے لئے محراب و منبر سے تائید کی ضرورت تھی۔ یہ ہماری بدبختی ہے کہ آج جب کہ ساری دنیا رفتہ رفتہ زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، ملوکیت کی لعنت کو جسدِ انسانیت سے الگ

کر چکی ہے پاکرنے کے لئے کوشاں ہے۔ ملوکیت اپنے تمام استبداد قہرمانیت کے ساتھ اگر کہیں مسلط ہے تو مسلمانوں کے ملکوں میں۔ پاکستان کی مملکت نئی نئی وجود میں آئی ہے۔ لہٰذا یہاں توقع کی جاسکتی ہے کہ ملوکیت کی لعنت اس پر مسلط نہیں ہوگی۔ کیونکہ جماعتِ اسلامی ایک عجیب فریب انگیز انداز میں شخصی اجارہ داریوں کی لعنت کو پاکستان پر مسلط کرنے کے درپے ہے۔ بظاہر دیکھیئے تو ملا ازم کے دشمن لیکن ذرا نقاب سرکا کر جھانکئے تو وہی ملوکیت کے قائم کرنے والے متشدد ملا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہم قدامت پرست ملا نہیں بلکہ ماڈرن لیڈر ہیں، انہوں نے انگریزی کے چند الفاظ یاد کر رکھے ہیں اور موقع بہ موقع انہیں دہراتے رہتے ہیں۔ ملوکیت کی لعنت کو پاکستان پر مسلط کرنے میں ان کی دو اغراض پوشیدہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں ان کا ذاتی فائدہ ہے کہ جماعت شخصی اجارہ داریوں کو قائم رکھے گی۔ شخصی اجارہ داری بہر حال اس کا معاوضہ دے گی۔ اور دوسرے یہ کہ پاکستان کے قیام اور تشکیل کے خلاف جو جذباتِ مخالفت ان کے سینے میں دس سال تک موجزن رہے ہیں وہ انھیں آج بھی رہ رہ کر اکسا رہے ہیں کہ پاکستان کو ایک ایسی مملکت نہ بننے دیا جائے جس سے یہ دنیا میں سر اونچا کر کے چل سکے۔ یہ لوگ چاہتے یہ ہیں کہ پاکستان بھی افغانستان، عرب، ایران وغیرہ کی طرح ملاؤں کے قبضہ میں رہے اور اس طرح دنیا کی زندہ قوموں کے رحم وکرم پر اپنی زندگی کے دن گذارے۔ قرآن ہر قسم کی شخصی اجارہ داری کے خلاف ایک برہنہ شمشیر تھا۔ اس نے دنیا میں سب سے پہلے ایک ایسا معاشرتی نظام قائم کیا جس میں نہ کوئی شخص کسی دوسرے کا محکوم تھا اور نہ محتاج۔ زمین اور اس کے تمام خزانے، آسمان اور اس کی تمام برکتیں، بالفاظِ دیگر خدا کی ربوبیت عامہ کے تمام وسائل اور ذرائع ہر انسان کے لئے یکساں طور پر کھلے تھے، جن سے وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما کرے گی اور اس طرح نوعِ انسانی شرفِ انسانیت کے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اقطار السمٰوات والارض سے بھی بلند ہو جائے گا۔ قرآن کا مقصود اور اسلامی نظام سے مفہوم تھا۔ لیکن ملوکیت کی اجارہ داریوں نے مذہبی آسروں کی بدولت وسائل و ذرائع کو پھر سے شخصی ملکیتوں میں لے لیا اور اس طرح رزق کے سرچشمہ پر قابض ہو کر دوسرے انسانوں کو اپنی ہوسناکیوں کا آلۂ کار بننے پر مجبور کر دیا (یاد رہے کہ ملوکیت سے مراد صرف بادشاہت ہی نہیں، اس کا مفہوم اس سے وسیع تر ہے۔ ہر وہ نظام جو رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت میں دے دیتا ہے یا ایسے نظامِ زندگی کی حمایت کرتا ہے۔ نظامِ ملوکیت کے دائرہ میں شامل ہے خواہ وہ فغفور و خاقان ہو یا گاؤں کا نمبردار یا ان کی حمایت کرنے والا) پاکستان میں قرآنی نظام کے نفاذ کا مطالبہ اسی مقصود کو لئے ہوئے ہے کہ اللہ نے جب ہمیں یہ امکانی قوت عطا کی ہے کہ ہم اس سرزمین میں جس قسم کا معاشرتی نظام چاہیں قائم کر لیں تو یہاں وہی نظام قائم ہونا چاہیئے جس میں انسانیت نہ اجارہ داروں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہو اور نہ انکی حمایتوں کی تسبیحوں

کے ناگوں میں پروئی ہوئی۔ یہ نظام ہر قسم کے سرمایہ دار اور اس کے حمایتی کے لئے پیغامِ موت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے جاگیر دار اور زمیندار یا تو بلاواسطہ اس کی علانیہ مخالفت کر رہے ہیں اور یا بالواسطہ مخالفت کے لئے اپنے حمایتی ڈھونڈ رہے ہیں۔ جماعتِ اسلامی پاکستان کی مخالفت کی وجہ سے بدنام ہو چکی تھی اس لئے وہ بھی اس تلاش میں تھی کہ انہیں حصولِ مدارج کے لئے کہیں سے تقویت کا سامان مل جائے۔ یہی وہ تقاضے ہوتے ہیں جہاں ملوکیت اور ملائیت میں سمجھوتا ہوا کرتا ہے۔ آنے والے انتخابات نے اس کے لئے اور بھی فضا ساز گار کر دی اور یہ سمجھوتا عمل میں آگیا چنانچہ جماعتِ اسلامی، جاگیرداری اور زمینداری کو عین کتاب و سنّت کے مطابق ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ اس کا نام رکھ رہی ہے احیائے دین اور قانونِ شریعت کا نفاذ

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک　　　سر برآر و ایں قیامت درمیانِ خلق بیں

اس پر طرّہ یہ کہ اپنے آپ کو یہ جماعت سرمایہ داری اور جامد مذہبیت کی مخالفت قرار دیتی ہے چنانچہ مودودی صاحب اور ان کے رفقاء کی نظر بندی کے سلسلہ میں ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۰ کے اشارات میں ارشاد ہوتا ہے کہ خدا کے دین کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کا علم جب بھی کسی بندۂ حق نے اٹھایا ہے تو اس کا راستہ روکنے کے لئے حکومت، سرمایہ داری اور جامد مذہبیت کی مختلف طاقتیں دوش بدوش کھڑی ہوگئی ہیں۔ کتنا بڑا ہے یہ فریب جو بھولے بھالے مسلمانوں کو دیا جا رہا ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ وجوہات جن کی بناء پہ طلوعِ اسلام، جماعتِ اسلامی کے مسلک کی مخالفت کرتا ہے۔ ہم اس باب میں صرف اتنا گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ آپ مخالفت اور موافقت کے تمام تاثرات سے الگ ہٹ کر ان تصریحات پہ ٹھنڈے دل سے غور کیجئے جو سطورِ بالا میں پیش کی گئی ہیں اور اس کے بعد سوچئے کہ کیا کوئی ایسا مسلمان جو مفاد پرستی کے جذبات سے الگ ہو کر اپنا لائحہ عمل قرآن کی روشنی میں متعیّن کرنا چاہتا ہو کسی صورت میں بھی جماعتِ اسلامی کے مسلک کی تائید کر سکتا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے صاحبِ مقدّم اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی زندگیوں میں جماعتِ اسلامی کو اپنے حق میں پروپیگنڈہ کرنے کے لئے بہت سا مسالہ مل جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام خود ان لوگوں کی نہج زندگی کے خلاف سرتاپا صدائے احتجاج ہے۔ لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ ہم موجودہ کوئی جگہ جو نئی بساط بچھانا چاہتے ہیں وہ کیسی ہے۔ طلوعِ اسلام خالص قرآنی نظامِ ربوبیت کے نفاذ کا مدعی ہے۔ جماعتِ اسلامی اس کے برعکس شخصی اجارہ داری اور اس اجارہ داری سے وابستہ عیش پرستیوں کے لئے شرعی جواز کی سندیں تلاش کرتے اور انسان کی فکری صلاحیتوں کو معطل کر دینے والی ملائیت کے نظام کو مسلط کر دینے کے لئے کوشاں ہے۔ اور اس کا نام انہوں نے رکھا ہے نظامِ اسلامی

(فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اور قانونِ شریعت۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ اس نظام کو اسلام سے کیا واسطہ۔ موضوع
اسلام کس طرح اس نظام، اور اسے اسلامی کہہ کر پیش کرنے والوں کی حمایت کر سکتا ہے۔

مہاجرین کا مسئلہ | ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کی آئے دن خون ارزانی پر حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے حکومتِ پاکستان کو ہندو مسلم آبادی کے تبادلہ کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا :۔

ہمارے خیال میں دونوں مملکتوں میں خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی اطمینان بخش صورت پر ہو سکتی ہے کہ وہ باہمی رضامندی اور مفاہمت سے تبادلہ آبادی کو ممکن بنا دیں اور اسطرح ہمیشہ کے لئے ان خاردار جھاڑیوں سے نجات پالیں۔ یہ کچھ اوّل و آخر زود یا بدیر کرنا ہی ہوگا جتنی جلدی یہ کر لیا جائے اتنا ہی یہ دونوں مملکتوں کے حق میں نفع بخش ہوگا۔ جتنی دیر کی جائے گی دشواریاں بڑھتی جائیں گی۔ کچھ عرصہ پیشتر ترکوں اور یونانیوں کی ملحقہ مملکتوں کو بھی اسی قسم کی دشواری پیش آئی تھی۔ انہوں نے سیاسی عاقبت اندیشی سے کام لیا اور باہمی سمجھوتے سے متعلقہ حکومتوں کے زیرِ اہتمام تبادلہ آبادی کے مراحل طے کر لئے اور اس کے بعد دونوں مملکتیں امن اور چین سے رہنے لگیں۔ اگر یہ کچھ وہاں ہو سکتا تھا تو یہاں کیوں نہیں ہو سکتا۔

ہماری پیش کردہ تجویز کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن العمل ہو سکتی ہے جب اس پر ہندو بھی رضامند ہوں لیکن اگر ہندو اس پر رضامند نہ ہوں تو؟ یہ صورت واقعی درخورِ اعتنا ہے بالخصوص اس لئے کہ ہندو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ پاکستان کے مسلمان اپنی ہندو اقلیت کی حفاظت بہرحال کرے گا اس لئے کہ اس کا فلسفہ زندگی اسے ظلم اور ناانصافی کی کبھی اجازت نہیں دے گا۔ لہٰذا سوال کی نوعیت یوں ٹھہری کہ اگر ہندو تبادلہ آبادی پر رضامند نہ ہو تو کیا ہندوستان کے مسلمانوں پر پاکستان کے دروازے بند کر دیئے جائیں اور اسطرح انہیں بے کسی اور بے بسی کی حالت میں چھوڑ دیا جائے کہ وہ یا تو ذلّت کی زندگی جئیں اور یا بے چارگی کی موت مریں۔ خالص سیاسی اعتبار سے اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے سیاسی اعتبار سے وہاں کا مسلمان بھارت کی رعایا ہے اور اسے اپنے معاملات اپنی حکومت سے خود سلجھانے چاہئیں۔ ہم اپنے ملک میں بسنے والے مسلمانوں کی حفاظت اور بہبود کے ذمہ دار

لے جماعت اسلامی غلامی کو عین شریعت کے مطابق بتاتی ہے۔ چنانچہ طلوع اسلام میں مودودی صاحب کا وہ مضمون شائع ہو چکا ہے جس میں انہوں نے جنگ کے قیدیوں کو غلام اور انکی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر، بلا قیدِ تعداد، امراء کے محلات میں داخل کرنے کو شریعتِ حقّہ کے تقاضوں میں سے بتایا تھا اور ملوکیت کی اس ہوس پرستانہ لعنت کو اسلام کے لئے وجۂ فخر قرار دیا تھا!

ہیں۔ دوسرے ملک میں بسنے والے مسلمانوں سے سوائے لفظی ہمدردی کے ہمارا کچھ تعلق نہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ سیاسی نقطۂ خیال سے یہ جواب نہایت مدلل اور یہ طرزِ عمل بالکل مناسب ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایک مسلمان (یعنی قرآن پر ایمان رکھنے والے انسان) کے نزدیک بھی یہ جواب معقول اور یہ اسلوب فکر مناسب قرار پائے گا؟ جیسا کہ ہم اپنی آزادی کی دس سالہ جدوجہد میں اعلان کر چکے ہیں۔ (اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے دعوئے آزادی کی بنیاد ہی اسی مسلمہ پر تھی) کہ مسلمان کی قومیت کا مدار کسی ملک کی حدود و ثغور نہیں ہوتیں بلکہ اس کی قومیت وحدتِ فکر و عمل سے تربیت پاتی ہے جس کا نام دین کی اصطلاح میں ایمان ہے۔ ہم نے اپنی جداگانہ قومیت کے دعوے کو انگریز اور ہندو دونوں سے اسی بنیادی حقیقت کی بناء پر منوایا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم تھی، مسلّم ہے اور مسلّم رہے گی کہ مسلمانوں کی قومیت کا مدار ایمان کے سوا اور کسی شرط پر نہیں۔ بنا بریں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ملکی تقسیم کا خط ادھر کے مسلمانوں کو ہم سے ایک الگ قوم نہیں بنا سکتا۔ اگر ہم میں سے کوئی اس تقسیمی خط کو جداگانہ قومیت کا معیار قرار دیتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ قرآن کے بنیادی تقاضے سے علی الاعلان انکار کرتا ہے بلکہ یہ بھی کہ وہ دنیا کو یہ بھی بتاتا ہے کہ ہماری جنگِ آزادی میں جداگانہ قومیت کا تقاضا محض ایک وکیلانہ حربہ تھا یا سیاسی چال۔ خدا پناہ میں رکھے ایسے شخص سے جو قرآنی حقیقت کا اس طرح انکار کرے اور پوری کی پوری ملتِ اسلامیہ پاکستانیہ کو ایسا منافق ثابت کرے۔ لہٰذا اس حقیقت کبریٰ میں کسی شبہ یا تاویل کی کوئی گنجائش نہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان ایک ہی ملّت کے افراد اور ایک ہی جسم کے اعضاء ہیں۔ اس لئے اگر ہندو تبادلۂ آبادی پر رضامند نہ بھی ہو تو بھی ہم کسی صورت میں بھی ہندوستانی مسلمانوں پر اپنا دروازہ بند نہیں کر سکتے۔ ہماری سیاست کا مرکز حریم کعبہ ہے جس کے متعلق قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ وہ سواءً العاکف والباد ہے یعنی اس کے دروازے وہاں کے رہنے والوں اور باہر سے آنے والوں سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں۔ ہم جس مقام پر بھی اسلامی حکومت کے قیام کریں گے کعبہ کا سیاسی قانون ہمارے آئین و دستور کی بنیاد ہوگا۔ اس لئے اگر کعبہ کا دروازہ ملکی اور غیر ملکی مسلمانوں میں تمیز نہیں رکھتا اور ہر ایک کے لئے کھلا کھلا اعلان کرتا ہے کہ ومن دخلہ کان اٰمنا۔ یعنی جو بھی اس گھر میں داخل ہو گیا وہ ہر قسم کے خطرات سے مامون ہو گیا تو وہ کونسا مسلمان ہے جو قرآن پر ایمان رکھتے ہوئے یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ پاکستان کا دروازہ ہندوستان کے مسلمانوں پر بند ہے؟ ہماری سیاسی مصلحت کوشیوں کے تقاضے کچھ بھی ہوں لیکن دین کا تقاضا ان سب پر غالب رہے گا۔ اور اگر ہمارے لئے قولِ فیصل دینی تقاضا نہیں بلکہ سیاسی مصلحت کوشیاں اور ہنگامی مفاد انگیزیاں ہی ہیں تو پھر ہمیں ان اعلانات سے فوراً دست بردار

ہو جانا چاہیئے کہ پاکستان اسلامی دستورِ زندگی کی تشکیل کے لئے وجود میں لایا گیا ہے کبر مقتا عندالله ان تقولوا ما لا تفعلون۔

بنا بریں یہ خیال ایک لمحہ کے لئے بھی ہمارے دل میں نہیں آنا چاہیئے کہ جو مسلمان اس وقت پاکستان میں ہیں، پاکستان انہی کا گھر ہے اور جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے ہیں وہ غیر ہیں، ان کا اس گھر میں کوئی حصہ نہیں۔ پاکستان وہ مسجد ہے جس میں ہر مسلمان کا برابر کا حصہ ہے۔ اور قرآن کے فیصلہ مطابق "اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جو لوگوں کو اللہ کی مساجد میں آنے سے روکے"۔ اس لئے پاکستان کے دروازے ہندوستان کے مسلمانوں پر کسی صورت میں بھی بند نہیں کئے جا سکتے۔ ولو کرہ المشرکون لہٰذا ..... ہمیں ان مسائل کے دوسرے حل تلاش کرنے ہوں گے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے پاکستان میں آجانے سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ دردِ سر کا علاج سر کو کاٹ کر الگ پھینک دینے سے نہیں ہوا کرتا۔ جو طبیب اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں جانتا وہ جتنی جلدی اپنے دعوئ طبابت سے دست کش ہو جائے اتنا ہی نوعِ انسانی کیلئے مفید ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے پاس اتنی کثیر آبادی کے لئے گنجائش کہاں ہے؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر دس برس میں پاکستان کے موجودہ مسلمانوں کی اپنی آبادی ہی سوا ئی یا ڈیوڑھی ہو جائے تو کیا آپ آبادی کے اس اضافہ کو بحیرۂ عرب میں ڈبو دیں گے! اس وقت بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا جو کچھ اس وقت کیا جائے گا اسے آج ہی کر لیجئے۔ حکومت کرنے والی قوموں کے تدبر کی آزمائش ایسے ہی مسائل کے حل سے ہوا کرتی ہے۔

ممکن ہے یہ بھی کہا جائے کہ سوال جگہ کا نہیں معاشی مشکلات کا ہے۔ اس امر کا فیصلہ کہ پاکستان کے معاشی ذرائع اتنی آبادی کے لئے کفیل ہو سکتے ہیں یا نہیں صحیح اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے جو ہمارے ہاں موجود نہیں۔ لیکن ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ جو کچھ ہمیں ملا ہے اس کی تقسیم اگر مساویانہ حیثیت سے کر دی جائے تو یہی ذرائع کم از کم چار گنا زیادہ آبادی کی ضروریاتِ زندگی کے لئے بآسانی مکتفی ہو سکتے ہیں۔ اس تقسیم کا صحیح طریق یہ ہے کہ ان ذرائع پیداوار زمین کارخانے، معدنی ذرائع وغیرہ کو افراد کی ملکیتیں قرار دینے کی بجائے ملت کی مشترکہ ملکیت قرار دیا جائے جن کے ماحصل میں ہر فردِ ملت کا برابر کا حصہ ہو۔ جس غریب گھر میں چار روٹیاں پکتی ہیں اس کے آٹھ افرادِ خاندان آپس میں آدھی آدھی روٹی بانٹ لیتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ان میں سے ایک شخص پیٹ بھر کر کھا لے اور باقی سات بھوکے سو رہیں۔ اس وقت ہم پر ایسا ہی وقت آپڑا ہے اور اس مشکل کا حل بھی یہی ہے۔ اس وقت سارے پاکستان میں تمام ذرائع پیداوار چند گنتی کے خاندانوں کے قبضہ میں ہیں۔ یہی ہیں جو یہاں کے غریبوں کو انسانی سطح پر آنے نہیں دینا چاہتے اور یہی ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی وہیں بند رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ان تمام

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دے دیا جائے تو ان سے نہ صرف یہ کہ پاکستان کے موجودہ مسلمانوں ہی کی اقتصادی سطح بلند ہو جائے گی بلکہ یہ بھی کہ ہم ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو یہاں جوق در جوق بسا سکتے ہیں۔ ہماری مشکل معاشی کمزوری نہیں بلکہ یہ ہے کہ مترفین کا گروہ رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھوں میں لئے بیٹھا ہے اور خدا کی ربوبیت کو عام نہیں ہونے دیتا۔

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اگر اربابِ حکومت کے دل میں اس مسئلہ کے حل کا جذبۂ صادق ہے تو اس کے لئے صرف عزمِ راسخ کی ضرورت ہے باقی سب کچھ یہاں موجود ہے ولما فتحوا متاعهم وجدوا بضاعتهم ردت اليهم۔ ہمارا سامانِ زیست خود ہماری اپنی بوریوں میں بند ہے۔ بس سوال ان بوریوں کے منہ کھول دینے کا ہے۔

اس ماہ کی اشاعت میں محترم پرویز صاحب کا کوئی مضمون شائع نہیں ہوا اس تعجب خیز بی کو دُور کرتے ہوئے ادارۂ طلوعِ اسلام نے لکھا:۔

پرویز صاحب کی علالت قارئین کرام بادی النظر ہی میں اس اشاعت میں یہ نمایاں کمی محسوس فرمائیں گے کہ اب کے پرویز صاحب کا کوئی مضمون شریکِ اشاعت نہیں۔ خود ادارہ طلوعِ اسلام کو قارئین سے کہیں زیادہ اس افسوسناک کمی کا احساس اور دُکھ ہے لیکن کیا کیا جائے حالات نے اس کمی کو ناگزیر بنا دیا۔ پرویز صاحب کے شب و روز جس والہانہ جذب و انہماک سے قرآن کے مطالعہ اور تفکر میں گزرتے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ کثرتِ کار کے باعث ان کی صحت ایک عرصہ سے خراب چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ قلب اور جسم کی آویزش میں جسم کے تقاضوں کا استخفاف کیا ہے۔ سو اتفاق سے ان دنوں ان کی صحت زیادہ خراب ہو گئی اور ڈاکٹروں کے مشورے پر انہیں محض شغلِ تحریر عارضی طور پر ترک کرنا پڑا بلکہ تبدیلیٔ آب و ہوا اور آرام کے لئے کراچی سے باہر تشریف لے جانا پڑا چنانچہ ان دنوں آپ کراچی میں نہیں۔ ہماری دلی دعا ہے کہ آپ بہت جلد صحت یاب ہو کر بزمِ طلوعِ اسلام میں شریک ہو سکیں خدا کرے ان کی غیر حاضری ایک اشاعت سے آگے نہ بڑھے:۔

اگست سنہ ۱۹۵۰ء

اس ماہ کے طلوعِ اسلام کے صفحہ اوّل پر ۱۵ اگست کا پیغام شائع ہوا ہے یہ پیغام کیا ہے؟ ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۵ اگست کا پیغام شام کے سفر سے واپسی پر، حضرت عمرؓ نے دور دراز وادی میں ایک خیمہ دیکھا۔ حسبِ معمول آپ تحقیقِ احوال کے لئے خیمہ میں گئے تو وہاں ایک

بڑھیا نظر آئی۔ بغیر بتائے کہ آپ کون ہیں اس سے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے؟ اس نے شکایت کی کہ حکومت کی طرف سے اس کی خبر گیری نہیں ہو رہی جس کی وجہ سے اسے تکلیف ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم نے حکومت تک اپنی تکلیف کی اطلاع بھی پہنچائی ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ یعنی اطلاع نہیں پہنچائی۔ حضرت عمرؓ نے معذرت کی اور کہا کہ جب تم نے اطلاع نہیں پہنچائی تو پھر خلیفہ کو اتنی دُور سے تمہارا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟

بڑھیا نے کہا کہ:۔

جب عمرؓ کو رعایا کا حال معلوم نہیں تو پھر خلافت کیوں کرتا ہے؟

حضرت عمرؓ اس واقعہ کو اکثر دہرایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے مجھے اس حقیقت سے اس بڑھیا نے باخبر کیا کہ خلافت کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

اور جب رعایا کا حال معلوم ہو جاتا تھا تو پھر کیا ہوتا تھا؟

آپؓ ایک رات گشت کر رہے تھے کہ مدینہ سے تین میل باہر، ایک خیمہ میں بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بچے بھوکے ہیں اور سامانِ خوراک ختم ہو چکا ہے آپ اسی وقت مدینہ واپس آئے۔ بیت المال سے آٹا، گوشت کھجوریں وغیرہ لیں اور اپنے خادم سے کہا کہ اس سامان کو میری پیٹھ پر لاد دو۔ خادم نے کہا کہ میں اٹھا کر لئے چلتا ہوں۔ فرمایا کہ ان بچوں کے لئے بروقت سامانِ خوراک نہ پہنچانے کا جرم عمر کا ہے جب تم اس جرم کے بار کو قیامت کے دن نہیں اٹھاؤ گے۔ بلکہ اسے عمرؓ کو خود اٹھانا پڑے گا تو اب تم اس بوجھ کو کیوں اٹھاؤ۔ عمرؓ خود کیوں نہ اٹھائے؟ چنانچہ سامان اٹھا کر خیمہ میں آئے۔ خود چولہا جھونکا کھانا تیار ہوا تو بچوں نے کھایا پیا اور اچھلنے کودنے لگے۔ بچوں کی والدہ نے کہا کہ۔

امیر المؤمنین بننے کے قابل تم ہو، نہ کہ عمرؓ!

امیر المؤمنین عمرؓ جب اس واقعہ کو یاد کیا کرتے تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جب مجھ سے پوچھا جائے گا کہ ان بچوں کو اتنا وقت کیوں بھوکا رہنا پڑا تو کیا جواب دوں گا؟

"حکومت" کا تاج ہر بوالہوس کے سر پر راست آسکتا ہے لیکن "خلافت" کا بوجھ ہر کندھا نہیں اٹھا سکتا۔

ع یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

لمعات اس ماہ کے لمعات میں محترم پرویز صاحب نے سرزمین پاکستان کی حفاظت، ملّت اسلامیہ کی قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت، ملک کے داخلی حالات مثلاً ظلم، ناانصافی، رشوت ستانی، بددیانتی، اعزہ پروری، اقربا نوازی، بداخلاقی۔

پر تنقید و تبصرہ فرماتے ہوئے انکی روک تھام اور اصلاح کے لئے مفید مشورے دیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

ظهر الفساد فی البر و البحر

زندگی کے ہر گوشے میں ناہمواریاں نمودار ہو گئیں

مقام مسرت و اطمینان ہے کہ علی رغم انف عدو سرزمین پاکستان پر زندگی کا تیسرا سال بھی خیریت سے گذر گیا اور اس کے بدخواہوں نے اس سرزمین کی تباہی کے لئے جو منصوبے باندھ رکھے تھے وہ ان کی ہزار آرزوؤں اور کوششوں کے باوجود خاسر و نامراد رہے۔

ع بایں مژدہ گر جاں فشانم رواست

دوسروں کے لئے پاکستان کی سرزمین شاید صرف اس لئے عزیز ہو کہ یہاں انھیں جان اور مال کی سلامتی کا گوشہ یا ان کی خوشحالیوں اور ترقیوں کا ذریعہ مل گیا۔ یہ امر بجائے خویش کچھ کم گراں قدر نہیں۔ دنیا میں امن و سلامتی کی ضمانت اور بہبودیوں اور مرفہ الحالیوں کی کفالت ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ لیکن طلوعِ اسلام کے نزدیک پاکستان اس سے کہیں زیادہ عزیز تر ہے، اس لئے کہ اس کے تصورات کے مطابق یہی وہ سرزمین ہے جہاں ہمیں یہ امکانی قوت حاصل ہے کہ ہم چاہیں تو اس قرآنی نظام کو پھر سے مشہود صورت میں سامنے لے آئیں جو نوعِ انسانی کی فلاح و سعادت کا موجب ہے اور جس کی عدم موجودگی سے انسانیت اس قدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ مصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ نے جب ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو اس کا مقصد بھی بتایا تھا کہ اس سے مسلمان اس نہج کی زندگی بسر کرنے کا امکان حاصل کر لیں گے جو ان کے لئے ان کے خدا نے متعین کی اور جسے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے ان کے رسولؐ نے متشکل کر کے دکھا دیا۔ طلوعِ اسلام اس پیغامِ حقیقت کتا کا نقیب اور اس دعوتِ انسانیت ساز کا علمبردار ہے، اس لئے اس کے نزدیک پاکستان کی سرزمین عزیز ترین متاعِ حیات ہے کہ اسی خاک سے وہ اس شجرِ طیب کی نمود و بالیدگی کی توقعات رکھتا ہے جس کے متعلق خالقِ فطرت نے کہا ہے کہ اصلها ثابت و فرعها فی السماء

پھر یہ حقیقت ہے کہ جو شے جس قدر زیادہ عزیز ہوتی ہے اسی قدر اس کی حفاظت کا فکر زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ جس بوڑھے باپ کا ایک ہی بچہ ہو اور اس بچہ کے ساتھ اس کی زندگی کی تمام آرزوئیں وابستہ ہوں وہ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ یوسف کی محبت دیدہ یعقوب ہی سے پوچھی جا سکتی ہے۔

لیکن وہ محبت محبت نہیں دشمنی ہے جس میں تربیت کو نظر انداز کر دیا جائے یا اپنے آپ کو غلط اطمینان سے فریب میں رکھا جائے اور اس طرح حقائق سے چشم پوشی کر لی جائے۔ جس بچے سے

محبت ہوتی ہے اسے کسی وقت چھینک بھی آجائے تو اس کا باپ فوراً کسی حکیم کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بچے کو تپ دق ہو رہی ہو اور وہ اس پہ بھی یہ سننے کے لئے تیار نہ ہو کہ بچہ بیمار ہے۔ یہی تقاضائے محبت ہے جس نے آج تک طلوعِ اسلام کو پاکستان کی داخلی خرابیوں کی طرف سے چشم پوشی نہیں کرنے دی۔ کشتی کا سوراخ صرف ملاحوں کا نقصان نہیں ہوا کرتا بلکہ کشتی کے مسافروں کا بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ اس لئے جو مسافر کشتی میں سوراخ ہوتے دیکھ کر اس لئے خاموش رہے کہ اس سے میرا کیا بگڑتا ہے، کشتی خراب ہوتی ہے تو نقصان ملاحوں کا ہے، اس سے زیادہ نادان کوئی نہیں۔ اور جب صورت یہ ہو کہ وہی مسافر اور وہی ملاح ہوں تو پھر ایسے وقت میں اغماض اور خاموشی نادانی ہی نہیں جرم بن جاتی ہے۔ طلوعِ اسلام اپنے اس فریضہ کا پوری طرح احساس رکھتا ہے اور یہی احساس ہے جو اسے اس پہ مسلسل آمادہ رکھتا ہے۔ وہ پاکستان کی داخلی کمزوریوں کو تنقیدی نگاہ سے یہ کھتا ہے تاکہ مرض کا علاج شروع ہی سے ہو جائے۔ آج کی صحبت میں بھی جو کچھ عرض کیا جائے گا وہ اسی احساس کا نتیجہ اور اس فریضہ کا مظاہرہ ہوگا۔

آپ کراچی سے خیبر اور کوئٹہ سے لاہور جہاں جی چاہے چلے جائیے (اور یہی حال مشرقی پاکستان کا ہے) سفر میں حضر میں، شہروں میں، بستیوں میں، جنگلوں میں پہاڑوں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، گھروں میں، محفلوں میں، خلوتوں میں، جلوتوں میں، ریلوں میں، لاریوں میں، سڑکوں میں، گلیوں میں، کسی مقام پہ جائیے اور کسی سے بات کیجئے آپ کو بالعموم ہر شخص نالاں و گریاں دکھائی دے گا کہ پاکستان میں ظلم، ناانصافی، رشوت ستانی، بددیانتی، اعزہ پروری، اقربا نوازی، بداخلاقی و بے حیائی عام ہو گئی ہے عدالتوں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، غرضیکہ جہاں بھی انسانوں کو انسان سے واسطہ پڑتا ہے کوئی معاملہ بھی اصول اور قانون کے ماتحت طے نہیں پاتا بلکہ ذاتی مفاد پرستیوں اور شخصی مصلحتوں کے مطابق فیصل ہوتا ہے بڑے سے بڑے سے لے کر چھوٹے تک ہر صاحبِ اختیار اپنے اختیارات کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کر رہا ہے، رشوت کے چرچے کھلے بندوں ہوتے ہیں، مراعات کی خرید و فروخت علی الاعلان ہوتی ہے اور جو چیزیں بازاروں میں علی الاعلان بکتی نہیں وہ اندھیری کوٹھڑیوں میں بلیک مارکیٹ کی سیاہ چادر کے نیچے فروخت ہوتی ہیں۔ دفاتری شعبوں میں حکام بالا ماتحتوں کی نالائقی اور کام چوری سے نالاں ہیں اور ماتحت افسرانِ بالا کی حرام خوری اور اعزہ نوازی کے شاکی محتسبین کے متعلق شکایت ہے کہ سوئی کی چوری پہ کہرام مچا دیا جاتا ہے اور پہاڑ کے پہاڑ نہایت صفائی سے ہضم کرا دیئے جاتے ہیں۔ یہ باتیں ہر شخص کی زبان پہ ہیں۔ اس میں شک اسی کو ہو سکتا ہے جو کبھی اپنے معاملات کی خلوتوں سے باہر نکل کر عوام سے ملا جلا نہیں یا اگر کبھی باہر آتا ہے تو ان سرکاری نمائندوں کے نرغے میں گھرا رہتا ہے جن کا منصب ہی یہی ہے کہ وہ نہ عوام کو ان کے قریب ہونے دیں، نہ ان کی کوئی بات ان کے کان تک پہنچنے دیں اور ہر سوال کے جواب میں "ہر طرح خیریت ہے" کہہ کر ان کے حسنِ انتظام اور شائستگی نظم و نسق کے قصیدے پڑھتے رہیں۔ سنا ہے کہ پچھلے زمانے میں بادشاہ

راتوں کو بھیس بدل کر رعایا کے حالات معلوم کیا کرتے اور یہ سنا کرتے تھے ـــــ کہتی ہے ان کو خلقِ خدا غائبانہ کیا ـــــ ہمارا خیال ہے کہ ہر وہ صاحبِ اقتدار جسے ان حقائق کی صداقت میں جو اوپر گذارش کئے گئے ہیں، کچھ شبہ ہو، اس طرح سے بھیس بدل کر کہیں سنیں کہ لوگ کیا کیا کہہ رہے ہیں، تو وہ خود اس کی شہادت دیں کہ لوگوں کے احساسات اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں جو ہم نے بیان کئے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے عام طور پر ضابطے اور اصول کا احترام اٹھتا جا رہا ہے اور ان کے دلوں سے پاکستان کی حکومت کا اعتماد روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے، وہ عناصر جو شروع سے پاکستان کے مخالف چلے آ رہے تھے لیکن آج اپنی مصلحت کوشیوں کے تحت پاکستان کی کھلی کھلی مخالفت نہیں کر سکتے وہ اس صورتِ حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور لوگوں کے جذبات کو اور مشتعل کر رہے ہیں۔ اس سے کسی کے پیشِ نظر (خاکم بدہن) خود پاکستان کی تخریب ہے اور کسی کے سامنے حکومت کی کرسیوں پر خود متمکن ہونے کی آرزو۔ ایک مردِ مومن نے کہا تھا کہ

سفینہ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا

دوسرے مردِ مومن نے اس نیک فال کو پورا کر کے دکھا دیا ہے کہ

ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ طوفاں سے پار ہو گا۔

لیکن آج کاروانِ موریِ ناتواں کی یہ نرم و نازک کشتی ہے اور ہزاروں "خضر صورت" بدخواہ اس میں سوراخ کرنے کے درپے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ان کی ان جرأتوں کا راز صرف اس میں ہے کہ یہاں وہ صورتِ حالات پیدا ہو گئی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

اگر کسی کو فطرت کے اس اٹل قانون پر یقین نہ بھی ہو کہ دنیا میں کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا اگر اس میں ہر شے اپنے مقام سے ہٹ چکی ہو تو بھی کم از کم تاریخ کی شہادتیں ہی اس کو اس نتیجہ پر پہنچانے کے لئے کافی ہونی چاہئیں کہ جو حالات ہمارے ہاں پیدا ہو چکے ہیں وہ بعینہٖ وہ نقشہ پیش کرتے ہیں جو سلطنتوں کے زوال کے وقت ہوا کرتا ہے۔ گبن کی "انحطاط و سکوتِ رومۃ الکبریٰ" کی تاریخ اٹھائیے، وہ اس عظیم الشان سلطنت کے زوال کے وقت اسی قسم کی صورتِ حالات بتاتا ہے۔ دُور نہ جائیے، ابھی کل کی بات ہے، سلطنت مغلیہ کو دیکھئے۔ اس کے آخری ایام میں ملک کی یہی حالت ہو چکی تھی۔ دنیا میں کمزور اور طاقتور سلطنتوں کے حالات کا موازنہ کیجئے، وہی سلطنتیں کمزور دکھائی دیں گی جن میں اس قسم کے حالات پیدا ہو چکے ہوں گے۔ بیشک سامان اور اسلحہ بڑی چیز ہے لیکن جس ملک میں اخلاقی بنیادیں اس درجہ کھوکھلی ہو چکی ہوں، وہاں ساز و سامان اور آلات و اسلحہ بھی بے کار ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہر قلبِ حساس کو خون کے آنسو رُلا دینے کے لئے کافی ہے کہ تاریخ میں جو صورت سلطنتوں کے انجام کے وقت پیدا ہوتی تھی ہمارے ہاں وہ صورت آغاز ہی میں پیدا ہو گئی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ سوائے ان بدنہادوں کے جو پاکستان کی مخالفت کا چور دل میں لئے

بیٹھے ہیں کوئی پاکستانی بھی پاکستان کی تخریب کا خواہاں نہیں ہو سکتا۔ عوام نہیں ہو سکتے کہ انہیں سر چھپانے کے لئے کوئی اور جگہ نہیں۔ خواص نہیں ہو سکتے کہ ان کا موجودہ عروج پاکستان ہی کی بدولت ہے ـــــ وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے ـــــ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اصلاح کا طریق یہ سمجھا گیا ہے کہ عوام ارباب نظم ونسق کو سنتے رہتے ہیں اور اوپر کے طبقے والے عوام کی شکایت کرتے رہتے ہیں حالانکہ دونوں طبقے مل کر قوم بنتے ہیں اور جو حالات اس وقت پیدا ہو چکے ہیں وہ ساری قوم کے ہیں، کسی ایک طبقے کے نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہندوستان میں ہماری یہ تمام قومی خرابیاں دبی ہوئی تھیں، اب انہیں ابھرنے کا موقع مل گیا ہے۔ پہلے فسادِ خون اندر تھا، اب وہ پھوڑے اور پھنسیاں بن جلد پر نمودار ہو گیا ہے۔ خون کا فساد کسی ایک حصۂ جسم تک محدود نہیں ہوا کرتا، سارے جسم میں یکساں طور پر موجود ہوتا ہے۔ ایک بات البتہ ضرور قابل لحاظ ہے، بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ ذمہ داریوں کا بوجھ خود بخود انسان کو راہِ راست پہ لے آیا کرتا ہے۔ ذمہ داریوں کو اپنے سر لینے والوں سے اس قسم کی توقع بھی بے جا نہیں ہوا کرتی۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ چونکہ ہم میں سے کسی نے بھی اس سے پہلے حکومت نہیں کی تھی، اس لئے ہمیں ابھی حکومت کے سلیقے نہیں آتے۔ لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ نالائقی (INEFFICIENCY) کا ظہور ہونا چاہیئے، فقدانِ سیرت ..... (CHARACTERLESSNESS) کا نہیں۔ سیرت (CHARACTER) کی بہت سی خامیاں ضبط سے دور ہو جایا کرتی ہیں اور اگر انسان چاہے تو اپنے اندر ضبط پیدا کر سکتا ہے۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ اربابِ نظم ونسق اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے اپنے اندر ضبط پیدا کر لیں گے اور اس ضبط سے نظم ونسق کی وہ خرابیاں دور ہو جائیں گی جو عدمِ ضبط سے پیدا ہوا کرتی ہیں۔ لیکن اس وقت تک کے شواہد اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اربابِ نظم ونسق ضبطِ نفس پیدا نہیں کر سکے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو ان کی مثال سے عوام بھی اپنے اندر نظم وضبط (DISCIPLINE) پیدا کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بڑی حد تک اربابِ حل وعقد کو قوموں کی تباہی اور کامیابی کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

لیکن اس مشکل کا حل یہ بھی نہیں کہ فلاں گروہ اپنے اندر فلاں بات پیدا نہیں کر سکا۔ مسافروں کی ناعاقبت اندیشی سے یا ملاّحوں کی خرابیٔ فکر ونظر سے کشتی میں چھید ہو رہے ہیں۔ اور سوال صرف یہ ہے کہ یہ چھید کس طرح سے بند ہوں۔ اگر یہ چھید بند نہ ہوئے نہ تو مسافر ہی باقی بچیں گے نہ ملاّح۔

اس قسم کے حالات میں ایک طریق کار یہ ہوا کرتا ہے کہ قوم میں کوئی ایک شخصیت ایسی پیدا ہو جائے جو پورے نظم ونسق کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور اپنے فیصلوں کو بچوں کے استاد کی طرح ناطقانہ طور پر منوا تی چلی جائے۔ ایسی شخصیت محض اپنی صلاحیت اور بلندیٔ کردار کی بناء پر زمامِ اقتدار

کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے، اسے عوام کی سستی مقبولیت (CHEAP POPULARITY) حاصل نہیں ہوتی۔ وہ ایک مشفق جراح ہوتا ہے جو مریض کی چیخ و پکار کی پرواہ کئے بغیر لا علاج حصے کاٹ کر الگ کر دیتا ہے اور قابلِ اصلاح زخموں میں نشتر پیوست کئے چلا جاتا ہے۔ ترکی کی مثال شاہد ہے کہ ایسے گئے گذرے حالات میں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اس قسم کی شخصیت کا ابھر کے افقِ قوم پر نمودار ہو جانا قوم کی زندگی کا موجب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کی شخصیت قوم کی پیداوار نہیں ہوا کرتی۔ مصطفےٰ کمال خلیفہ عبدالحمید اور خلیفہ عبدالمجید کی، ترکی کی پیداوار نہ تھا۔ لہٰذا یہ بھی کوئی طریق علاج نہ ہوا۔ اس لئے کہ جو دوائی اپنے اختیار کی نہیں اس کا تریاق ہونا کس کام کا۔ اس کے لئے تو یہی کہہ کر خاموش ہو جانا پڑتا ہے کہ جس طرح ہنگامی طور پر پاکستان کی زمین مل گئی اسی طرح اتفاقی طور پر اس کے سنبھالنے والا بھی پیدا ہو جائے گا۔

لہٰذا بات یہاں آکر ٹھہری کہ ان حالات میں اصلاح کی صورت کیا ہو؟ یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ہمارا موجودہ اوپر کا طبقہ اپنے اندر غالباً کسی تبدیلی کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ یہ طبقہ بالعموم سن رسیدہ ہے اور اس عمر میں اس قالب کا توڑنا بڑی ہمت کا کام ہوا کرتا ہے جس میں انسان کی عادات و اطوار ڈھل چکی ہوں۔ لہٰذا ان سے کسی تبدیلی کی توقع کرنا بیکار ہے۔ نہ ہی یہ تدبیر کچھ مفید مطلب ہو سکتی ہے کہ انکی جگہ دوسرے آدمی لائے جائیں، اس لئے کہ وہ بھی انہی قالبوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ آپ نے سندھ میں وزارتوں کی تبدیلیوں اور پنجاب میں اس کے تعطل کو بھی آزما دیکھا۔ قوم ساری ایک جیسی ہے اور کسی طبقہ کا یہ دعویٰ کہ اُسے دوسرے گروہ پر کوئی افضلیت حاصل ہے، محض انتخابی مہم کی تکنیک ہے خواہ اس پر شریعت کے لیبل لگا دیئے جائیں یا سرمایہ داری کی مخالفت کے۔ صورتوں کی تبدیلی سے سیرتیں نہیں بدل جایا کرتیں۔ اگر آج قوم میں کوئی ایسا گروہ موجود ہے کہ جسے اپنے بلندیٔ سیرت کا دعویٰ ہو تو وہ انتخابی راستوں سے ہی اصلاح نہیں کر سکتا۔ سیرت کی بلندی تو جس مقام پر بھی ہو اپنا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ چندنِ قصرِ کسریٰ اور فقیر کی جھونپڑی میں یکساں طور پر خوشبو پھیلاتا ہے۔

ہمارے نزدیک اصلاح کی وہی صورت ہے جو قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل میں نہایت حسین انداز میں بیان فرمائی۔ بنی اسرائیل کی وہی حالت ہو چکی تھی، جو آج ہماری ہے۔ مدتوں کی غلامی نے ان کے تمام درخشندہ جوہر سلب کر لئے تھے اور افسردگی اور دنائت کی تمام خرابیاں ان میں پیدا ہو چکی تھیں۔ صاحبِ ضربِ کلیم کے ید بیضا کی چمک انھیں فرعون کی غلامی سے نکال کر ایک آزاد خطۂ زمین میں لے آئی تھی، لیکن خطۂ زمین کے مل جانے سے ان کی سیرتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ ایک چھوڑ تین پیغمبر ان کے اندر موجود تھے۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور طور کی وادیوں میں حضرت شعیبؑ۔ لیکن وہ جہاں تھے وہیں رہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ سے کہہ دیا گیا کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ صرف اتنا انتظام کر لو کہ کوئی بیرونی خطرہ اس سرزمین کی تخریب کا باعث

ہو جائے۔ اس دوران میں قوم کی نئی نسلوں کو اپنے ہاتھ میں لو، انکی تربیت اپنے انداز سے کرو۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ادھر مرورِ زمانہ سے یہ بوسیدہ ہڈیاں رفتہ رفتہ ختم ہوگئیں اور اتنے میں وہ نوجوان تیار ہوگئے جنہیں خاص انداز سے پروان چڑھایا گیا تھا۔ یہ شاہین بچے ابھرے اور ایک ہی جھپٹ میں اس ارضِ موعود پر قابض ہو گئے جن میں ان کے بڑے بوڑھوں کو بڑے دلو نظر آیا کرتے تھے۔ لہٰذا پاکستان والوں کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلا کرتی ہیں۔ آج اس بات پہ نہ رویئے کہ موجودہ اوپر کا طبقہ سیرت وصلاحیت کے اعتبار سے کتنا پست ہے، نہ ہی اس پہ کہ نیچے کا طبقہ ضبط وانضباط کی رُو سے کس قدر خام ہے۔ رویئے اس پہ کہ قوم کی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہیں۔ حکومت کے نظم ونسق کے ہر دوسرے گوشے کی خامیوں کو برداشت کر لیا جا سکتا ہے لیکن آنے والی نسل کی صحیح تعلیم وتربیت سے متعلق گوشے کی خامیوں کو کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ نسل بھی ہماری موجودہ نسل کے نقشِ قدم پہ چلتی آئی تو پھر یہ سرزمین ہماری ہزار آرزوؤں کے باوجود کبھی منقولہ نہیں رہ سکے گی۔ ہم لوگوں سے یہ شکایت بھی سنتے ہیں کہ ہماری حکومت تعلیم کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہی۔ لیکن ان کی شکایت کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ حکومت نے کافی تعداد میں سکول نہیں کھولے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ سکولوں میں پڑھائی اچھی نہیں۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہ یہ نہیں۔ آپ قریہ قریہ میں بھی سکول کھول دیجئے اور ہر سکول کا نتیجہ سو فیصدی دکھا دیجئے تو بھی ہمارے نزدیک یہ صحیح تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی (LITERACY) اور تعلیم (EDUCATION) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں خواندگی ہی کو تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کے لئے خواندگی ضروری ہے۔ لیکن خواندگی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ زندگی ہمیشہ اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں۔ جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہوں گی، اسی قسم کی اس کی زندگی ہوگی اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو عشق ہوگا اسی قدر سعی وکاوش اور جذب وانہماک سے ان کے حصول اور تحفظ کے لئے انسان سرگرمِ عمل رہے گا۔ تعلیم زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے جس قسم کی تعلیم ہوگی اسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار لائی جائیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب فرمایا کہ یعلمھم الکتاب والحکمۃ (کہ وہ انہیں نظامِ زندگی اور محکماتِ حیات کی تعلیم دیتا ہے) تو اس سے مراد نوشت وخواند کی تعلیم نہ تھی بلکہ وہی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے اور جس کا نتیجہ انسان کی فطری صلاحیتوں کی بالیدگی (یزکیھم) ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے

زندگی کی صحیح اقدار نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں زندگی کی سب سے بڑی قدر انفرادی خوشحالی اور حصولِ اقتدار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم لیڈروں کا گروہ یا حیوانوں کا گلہ بن چکے ہیں۔ قرآن کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ وہ زندگی کی صحیح اقدار سامنے لے آتا ہے اور یہی اقدار سیرت کی بنیادیں بن جاتی ہیں۔ چونکہ قرآن وہ اقدار متعین کرتا ہے جس سے انسانیت کی پوری پوری نشوونما ہو جاتی ہے۔ اس لئے جس کسی کی سیرت ان اقدار کی بنیادوں پر متشکل ہوتی ہے اس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہ ظاہر ہے کہ رقبہ اور صنعت وحرفت کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے بہت سے خطوں سے پیچھے ہے اور جس رفتار سے دنیا ترقی کر رہی ہے اس کے پیشِ نظر ہم مغربی اقوام کے ہم پلہ کبھی نہیں ہو سکیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کیلئے ہمارے پاس ایک دوسرا میدان ہے اور وہ میدان ہے ان اقدار کا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ اقدار کسی اور فلسفۂ زندگی میں نہیں مل سکتیں۔ اس لئے جو کمیونزم ان اقدار کے قالب میں ڈھلے گا اس کی قوت کا جواب دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکے گا۔ یہ ہے وہ میدان جس میں نہ صرف یہ کہ ہم اپنی موجودہ خامیوں کو ہی رفع کر سکیں گے بلکہ مغرب کی ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔

تقسیم کے بعد قوم کو قانونِ شریعت کو نافذ کرو کا سلوگن دیا گیا۔ عوام کے تقلیدی ذہن نے اسے بڑا خوش آئند سمجھا اور یہ سلوگن بڑا مقبول ہو گیا۔ اس سلوگن کے پیچھے جو جذبۂ محرکہ تھا وہ انتخابات کے قریب آنے سے بے نقاب ہوتا چلا گیا۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی یہ حقیقت غور طلب تھی کہ قانونِ شریعت سے مراد کیا ہے اور اس کے نفاذ سے حاصل کیا ہوگا؟

اس چیز کو آج تک کسی نے متعین کر کے نہیں بتایا۔ اس لئے کہ اس سلوگن کو پیش کرنے والے اس کاروباری راز (TRADE SECRET) کو عام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ پہلے ہمیں برسرِ اقتدار کر دو پھر ہم بتائیں گے کہ قانونِ شریعت کیا ہوتا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ قانونِ شریعت سے مراد وہ تعزیری سزائیں ہو سکتی ہیں جو بعض جرائم کی پاداش میں نافذ کی جا سکتی ہیں، یا نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق مسائل۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر اس قانون کو نافذ بھی کر دیا جائے تو اس سے کون سی اصلاح کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ آج بھی تو (چند مستثنیات کے علاوہ) وہ تمام کام جرائم شمار کئے جاتے ہیں جنہیں ہماری شریعت جرائم قرار دیتی ہے اور ان جرائم کی سزائیں بھی مقرر ہیں۔ ان سزاؤں کی نوعیت میں کچھ فرق سہی لیکن بہرحال سزائیں تو موجود ہیں۔ ان سزاؤں کی موجودگی سے اصلاحِ احوال کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی۔ اس لئے اگر ان کی جگہ شرعی سزائیں نافذ کر دی جائیں تو پھر کون سی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ بالآخر ایسے ممالک بھی تو ہیں جہاں اس قسم کا قانونِ شریعت نافذ ہے، وہاں کے معاشرتی حالات ہم سے کسی صورت میں بہتر نہیں۔ لہٰذا قانونِ شریعت کے نفاذ کا مطالبہ نظامِ معاشرت کے بدلنے کا ہے۔ قرآن ایک نظامِ زندگی متعین کرتا ہے اور یہ نظام متشکل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ قوم کے دل ودماغ کی تعمیر ان خطوط پر نہ ہو جو

اس نظام کے قیام اور بقا کے ذمہ دار بن سکتے ہیں۔ اور یہ خطوط تعلیم ہی کے ذریعے سے نمایاں ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اصل مطالبہ صحیح قرآنی تعلیم کے اجراء کا ہونا چاہیئے پھر سن رکھنے کی قرآنی تعلیم سے مفہوم فن تجوید یا قرآن کی تفاسیر پڑھانا نہیں۔ اس تعلیم سے مراد یہ ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے سامنے وہ اقدار لائی جائیں جو قرآن متعین کرتا ہے۔ تاریخی شواہد اور آفاقی حوادث کی روشنی میں یہ بتایا جائے کہ یہ اقدار اس طرح انسانیت کی نشوونما کا موجب بن سکتی ہیں اور اس سے مختلف اقدار کیوں ایسے نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ اگر ہم نے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کر لیا تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کا خطہ ہی محفوظ رہ جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ نوع انسانی کی امامت اسی خطہ کے رہنے والوں کو نصیب ہو جائے۔

اگر قوم صحیح معنوں میں موجودہ صورتِ حالات میں تبدیلی کی خواہاں ہے تو اس کے لئے کرنے کا کام ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ارباب نظم ونسق کو اس پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ ملک میں صحیح قرآنی تعلیم کو نافذ کریں جس سے صحیح اسلامی نظام قائم ہو سکے۔ قوم نے تین سال بے معنی کوششوں میں ضائع کر دیئے۔ اگر ہم آج بھی اپنی کوششوں کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کر لیں تو بھی ہماری بگڑی کو بنتے کچھ دیر نہیں لگے گی۔ اگر قوم اس ضرورت سے متفق ہے کہ وہ حکومت سے صحیح تعلیم کا مطالبہ کرے اور اگر حکومت اس ضرورت کا احساس رکھتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ کام کس طرح سے کیا جائے تو اس باب میں ہم ہر طرح کی معاونت کے لئے تیار ہیں۔ سب سے پہلا کام مرکز میں ایک ایسی مجلس (کمیٹی) کا تعین ہے جو اس اہم مسئلہ کی جانچ پڑتال کرے اور اس کے بعد ملک کے لئے ایک پورا نصاب تعلیم تجویز کرے گا۔ اگر حکومت کو ضرورت ہو تو ہم یہ بھی بتا سکیں گے کہ ہمارے خیال کے مطابق اس اہم کام کے لئے کون کون سے لوگ موزوں ہیں۔

لیکن اگر قوم نے اس بنیاد کی ضرورت کا احساس نہ کیا اور اربابِ حکومت نے اپنے پیش نظر صرف یہی رکھا کہ عوام کو کس طرح سے خوش کیا جا سکتا ہے تو پھر زیادہ سے زیادہ ہوگا یہ کہ ایک طرف سرکاری مدارس سے کلرک پیدا ہوتے رہیں گے جو صرف روٹی کمانے کے لئے مشینوں کی جگہ کام میں لگائے جائیں گے اور دوسری مذہبی تعلیم کے دارالعلوم کھلیں گے جن میں وہ لوگ پیدا ہوں گے جنہیں روٹی کمانے کا سلیقہ بھی نہیں آئے گا، اور پاکستان کی حالت یہ ہوگی کہ دنیا کے دوسرے "اسلامی ممالک" کی طرح اقوامِ مغرب کے رحم وکرم پر دنیا کے نقشے پر موجود رہے گا اور جب ان کی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا ہو تو اس کا نام اس نقشہ سے بھی مٹایا جا سکے ویلتنی مت قبل ھذا وکنت نسیًا منسیًا